صدائے بازگشت

(افسانوی مجموعہ)

ذکیہ مشہدی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

صدائے بازگشت

(افسانوی مجموعہ)

ذکیہ مشہدی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

SADA-E-BAZGASHT

(AFSANVI MAJMUA)

by

Zakia Mashhedi

Year of 1st Edition 2003

ISBN 81-87667-62-1

Price Rs. 125/-

نام کتاب	صدائے بازگشت (افسانوی مجموعہ)
مصنفہ	ذکیہ مشہدی
سنِ اشاعت اوّل	۲۰۰۳ء
قیمت	۱۲۵ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی-٦

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 091-011-23211540

E-mail : ephdelhi@yahoo.com

شِبَل

اور

جہاں زیب

کے نام

صدائے بازگشت سے پہلے

میرے اس افسانوی مجموعے کا نام پہلے ''دیکھ کبیرا ردیا'' تھا جو میں نے بعض وجوہ کی بنا پر تبدیل کر دیا۔ اب یہ ''صدائے بازگشت'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

تلسی داس نے رام چرتِ مانس لکھنے کا سبب 'स्वांत: सुखाय तुलसी रघुनाथ्रा गाथा' کہہ کر خود اپنی تسکین قلب قرار دیا ہے۔ تلسی داس بہت بڑے شاعر تھے۔ جن فرقوں کے لئے رامائن کی حیثیت مذہبی صحیفے کی نہیں ہے وہ بھی رام چرت مانس کی شاعرانہ خوبیوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ میں تلسی داس سے اپنا موازنہ کرنے کی جسارت کی مرتکب نہیں ہو رہی ہوں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ بیشتر ادیب و شاعر اسلئے لکھتے ہیں کہ نہ لکھیں تو ان کے اندر کی بے کلی ان کے لئے سوہانِ روح بن جائے گی۔ واقعات، کردار یا حالات متاثر کریں تو ان پر گفتگو کرنا، انہیں دوسروں کے سامنے بیان کرنا بھی انسانی خصلتوں میں سے ایک ہے۔ ادیب و شاعر انہیں تحریر کے دائرے میں لا سکتے ہیں۔ بس یہی فرق ہے ان میں اور ان لوگوں میں جو مصنف نہیں ہیں۔ میری تحریروں میں بھی وہ لوگ اور واقعات سموئے ہوئے ہیں جنھوں نے کبھی ذہن کو نوک سنان سے کریدا۔ میں نے کہیں فیصلے صادر نہیں کئے ہیں۔ بس انہیں صفحات پر اتارا ہے۔ کبیر ہوتے تو آج شاید کچھ زیادہ روتے ہوتے۔

میری تحریروں کی کچھ ادبی اہمیت بھی ہے یا نہیں یہ طے کرنا ادب نواز قارئین کا کام ہے۔ یا ان کا جو ادبی دنیا میں محتسب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانے پڑھئے۔ اپنی رائے سے نوازیں گے تو ممنوں ہوں گی۔

☆☆

ذکیہ مشہدی

پتہ :
F-1, Graud Pallavi Court,
Judges Court Road,
PATNA-800004

فہرست

کیا	کہاں

☆☆

اجّن ماموں کا بیٹھکہ

اجّن ماموں کے بیٹھکے میں وہ منحوس خبر لے کر سب سے پہلے بابو انو کھے لال شری واستو ایڈوکیٹ وارد ہوئے تھے۔ ''اجی حضت کچھ سنا آپ نے؟'' انو کھے لال جب نارمل ہوتے تب بھی حواس باختہ ہی لگا کرتے تھے لیکن اُس دن تو بالکل ہی باؤلے ہو رہے تھے۔ ایسے جیسے پیچھے سے کسی بھوت پلید نے دوڑا رکھا ہو۔ دھم سے وہ اجّن میاں کے بیٹھکے کی خستہ حال کرسی میں ڈوب گئے۔ 'ارے میاں بکانو، ذرا ایک گلاس پانی تو لانا۔' انہوں نے پھولتی سانسوں کے درمیان ملازم کو آواز دی۔

''ہُوا کیا؟'' اجّن ماموں نے حقّے کی نَے منہ سے نکالی اور پھر منہ میں ڈال کر آرام سے گڑگڑانے لگے۔ یقیناً انو کھے کو آج پھر رام ناتھ اہیر کی مرکھنڈی گیا نے دوڑایا ہے۔ کتنی بار کہا ہے کہ شارٹ کٹ کے چکر میں اس کی گلی سے مت گذرا کرو۔ یا گذرو تو ذرا حلیہ درست رکھو۔ جھڑوس شکل دیکھ کر گیا بھڑکتی ہے۔ مگر وہ انو کھے ہی کیا جو کسی کی بات سن لیں۔

''ایں تو واقعی آپ کو کچھ نہیں معلوم؟''

''کچھ منہ سے پھوٹیے تو معلوم ہو''

''بابو رام پرشاد کی حویلی میں قتل ہو گیا ہے۔''

اجّن ماموں حقّے سمیت الٹ گئے۔'' کیا کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔ قتل! کس کا قتل؟ رام پرشاد کی حویلی میں؟ ارے وہاں تو صرف رام پرشاد کے خاصے معمر والد بابو ہر پرشاد ہی

رہا کرتے تھے اور دو چار نوکر چاکر۔ کیا ملازموں میں سے کسی کو......''

''قتل ہر پرشاد بابو کا ہوا ہے۔''

''ان بے چارے بزرگ سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ آپ رات کچھ زیادہ تو نہیں چڑھا گئے؟''

''کیا بات کرتے ہیں اجن ماموں۔'' انوکھے لال رپٹے میں انہیں اجن میاں کی جگہ اجن ماموں کہہ گئے ویسے اجن ماموں تھے تو جگت ماموں لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ برابر کے یار دوست ماموں کہنے لگیں۔ کبھی کوئی کہہ دیتا تو بڑی زور سے بگڑتے لیکن اس وقت ذہن دوسری طرف مائل تھا۔

''ارے بھائی ہوگا کچھ آپس کا معاملہ یا کوئی چوری کرنے کی نیت سے گھسا ہوگا اور وہ جاگ گئے ہوں گے۔''

''کچھ سامان بھی گیا؟''

''ابھی پتہ نہیں چلا''

اجن ماموں نے جلدی سے کھونٹی پر لٹکی شیروانی اٹھائی اور ٹوپی پھٹکاری لیکن حافظ صدر الزماں جو محلے میں حافظ بھنڈی کے نام سے مشہور تھے اپنی شیروانی ان سے پہلے چڑھا چکے تھے ماموں نے ٹوپی سر پر رکھی ہی تھی کہ حافظ بھنڈی ہانپتے کانپتے آن پہنچے۔ وہ اجن ماموں کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ سیدھے گالی سے بات کرتے لیکن اس وقت نہایت وحشت زدہ تھے۔ گالی کیا، مہذب الفاظ منہ سے نکالنے میں وقت ہو رہی تھی۔

''ارے بھائی لالہ ہر پرشاد مارے گئے۔ کیا زمانہ آن لگا ہے۔ بے ضرر معمر انسان۔ قتل وتل تو ہم نے بس ابن صفی کے ناولوں میں پڑھے تھے۔ یہ ہمارے محلے سے لگے ہوئے محلے میں قتل۔ بس کوئی دو سو گز کی دُوری پر۔''

''قتل۔ یعنی ابھی تھے، ابھی نہیں۔'' حاضرین میں ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یعنی ٹھکیدار رام دین۔ ''پانی کیرا بلبلا، اَس مانس کی جات، دیکھتے ہی چھپ جائے گا جیوں تارا پر بھات'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر ایک بڑا ڈپریسنگ دوہا دوہرایا۔ جب سے ایک نہایت منافع بخش ٹھیکے کا ٹنڈر ان کے رقیب نمبر ایک ٹھکیدار دین محمد کے نام کھل گیا تھا وہ دنیا کی بے ثباتی پر زیادہ غور

کرنے لگے تھے۔ رقیب بھی ایسا رقیب روسیاہ کہ نہ جانے کیسی کیسی تِگوم کر کے ٹنڈ رتو اپنے نام کھلوایا ہی، محلے کے بچوں کو انتہائی نا معقول کہبت بھی سکھا دی...... ''دنیا پودنیا...... باجرے کی روٹی، ٹکا مہینہ...... ''اب ٹھکیدار رام دین انگلی پر سفید براق دھوتی کی کور سنبھالتے نکلے نہیں کہ محلہ کی چھوٹی امت پیچھے لگی......

دنیا پودنیا...... کبھی کبھی کچھ یونہی ہو جایا کرتا ہے۔ دین محمد کو بھی دنیا پودنیا کہہ کر چڑایا جاسکتا تھا لیکن یہ اختراع پہلے ان کی طرف سے ہوئی تھی اور بچے رشوت کھا چکے تھے اس لیے چڑائے گئے رام دین۔ دونوں کا نصف حصہ مشترک تھا لیکن بقیہ غیر مشترک نصف کے لیے ایک دوسرے کو چڑاتے رہتے تھے لوگ ڈرتے تھے کہیں نوبت سر پھٹول تک نہ آجائے۔ آج بھی بچے پیچھے لگ گئے تھے۔ 'ٹھہر تو جاؤ حرامزادو۔ ایک ایک کو قتل نہ کیا تو کہنا......' ہمیشہ کی طرح انہوں نے دانت پیس کر کہا لیکن ان حرامزادے لڑکوں کی کون کہے ان سے ایک چوہا تک قتل نہ ہو پاتا۔ ایسے شریف، نیک دل کہ محلے میں قتل کی واردات سنی تو دل ایسا گھبرایا کہ دھوتی سنبھالتے سیدھے اجن ماموں کے بیٹھکے میں پہنچ گئے کہ چار لوگوں سے بات کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جایا کرتا ہے۔

'ابھی پرسوں ہی تو ملاقات ہوئی تھی۔ بازار میں ٹہلنے نکلے تھے، رام دین کے چہرے پر دلی تاسف تھا۔ اس زمانے میں بھی شرفاء کی ملاقات چوک میں ہو جایا کرتی تھی۔ شام کو سب کے سب ٹہلنے نکلتے۔ جو جوان تھے وہ ذرا شرماتے جھجھکتے بیویوں کے لئے پھول خریدتے اور دونوں میں گلوریاں بندھواتے۔ بزرگ قسم کے لوگ ناتی پوتوں کے لئے گنڈیریاں اور بتاشے خریدتے۔ بابو ہر پرشاد کی پہلی بیوی تو زمانہ ہوا کہ اللہ میاں کو پیاری ہو چکی تھیں۔ دوسری ایسی مونہہ زور تھیں کہ نہ وہ سنبھلتیں نہ ان کے میکے والے۔ اس لئے ہر پرشاد دمے کے علاج اور زمینوں کے مقدموں وغیرہ کے بہانے شہر میں تنہا رہا کرتے تھے۔ مہینے دو مہینے پر گاؤں جاتے اور بال بچوں سے مل آیا کرتے تھے۔ نہ وہ پھول خریدتے نہ گنڈیریاں۔ ہاں جب گاؤں جانا ہوتا تو مٹھائی اور پھلوں کے جھابے بندھوایا کرتے تھے۔

اجن ماموں نے دیر سے رُکی ہوئی ٹھنڈی سانس چھوڑی...... ''کیا بتایا جائے بھائی۔ میں بھی ان سے بس کل پرسوں ہی ملا تھا۔''

''بڑی تشویش کی بات ہے اس طرح کی واردات۔ کیا پتہ کل کلاں کوئی آئے اور ہمارا

گلا بھی داب کر چلتا بنے۔'' چق کے پاس دین محمد کھڑے کھنکھار رہے تھے۔

'' آؤ بھائی، آ جاؤ۔'' اجن ماموں نے اپنے مخصوص مخلص لہجے میں کہا

کوئی اور وقت ہوتا تو یہ صورتِ حال یعنی دونوں ٹھیکیداروں کا اجن میاں کے بیٹھکے میں اکٹھا ہو جانا، خالی از علت نہ ہوتی لیکن اس قدر سنگین واقعے کی خبر ملے تو ذاتی عناد پس پشت جا پڑتا ہے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

'' قریب قیامت کے آثار ہیں۔'' دین محمد نے فرمایا

'' کلجگ ہے، گھور کلجگ۔'' رام دین نے سر ہلا کر تائید کی۔

چلو ذرا نکل کر دیکھ آتے ہیں۔ اجن ماموں شیروانی پہن چکے تھے اور اپنے ہی بیٹھکے میں شیروانی ٹوپی چڑھا کر کسی مہمان کی طرح تکلف سے اکڑے بیٹھے عجیب مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی چاندی کی موٹھ والی چھڑی اٹھائی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارے احباب ساتھ چلے۔

رام پرشاد کی حویلی کے سامنے خلقت ٹھٹھ لگائے کھڑی تھی۔ پولیس والے ہٹو بچو کرتے آ۔ جا رہے تھے۔ حویلی بیچ بازار میں تھی۔ چاروں طرف دوکانیں ہی تھیں۔ بہت دن سے بابو رام پرشاد کہہ رہے تھے کہ اپنا بھی نیچے کا حصہ کٹڑے میں تبدیل کرادیں گے لیکن چونکہ خود زمینوں پر رہتے تھے اس لیے ادھر توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔ رہے ہر پرشاد تو اب اتنا کچھ جھنجھٹ ان کے بس کا نہیں تھا۔

ہا۔ بیچارے دکھیا۔ بغل میں کرانے کی بہت بڑی دوکان تھی۔ اس کے مالک عبدالشکور با قاعدہ آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ ساٹھ سے کوئی بس برس دو برس اوپر آئے ہوں گے۔ ابھی تو بیس برس اور جی لیتے۔ دمے کا کیا۔ دمے میں کہیں کوئی مرا کرتا ہے۔ وہ بھی جس کے پاس اتنی دولت ہو۔ ہمہ وقت ڈاکٹر حاضر۔ دوائیں ساری لکھنو سے آیا کرتی تھیں۔''

'' ارے ابھی تو ان کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ بس ہوئے ہوں گے چھ آٹھ مہینے...... کام پر جو سر منڈایا تو ابھی پورے بال تک نہیں اُگے تھے۔ نیک آدمی تھے۔ اپنے کام سے کام۔......'' کسی نے مزید معلومات مہیا کیں۔

'' داروغہ جی کیسے سپاٹ بلکہ کرخت چہرے کے ساتھ پوچھ تاچھ کر رہے تھے۔ ارے

صاحب ایک آدمی چلا گیا۔ کچھ تو چہرے سے ملال ظاہر ہو۔'' رامیشور دیال نے کہا۔ ان کی مٹھائیوں کی بہت بڑی دوکان تھی۔ بابو ہر پرشادان کے مستقل گاہکوں میں تھے۔ سب سے مہنگی مٹھائیاں خریدتے۔ بالائی کا دونا روز جایا کرتا تھا۔ بالائی پر کالی مرچ کا سفوف چھڑک کر کھاتے تھے کہ دمے میں فائدہ ہوتا ہے۔

بھیڑ ہٹایئے یہاں سے۔ کام کرنے دیجئے ہمیں۔ ایک پولیس والے نے ڈپٹا......

لوگ ذرا تتر بتر ہوئے لیکن پھر وہی جم غفیر۔ کاؤں کاؤں الگ۔ جتنے مونہہ اتنی باتیں۔ لیکن ایک بات مشترک تھی کہ مرنے والا بے چارہ بڑا نیک اور بے ضرر سا انسان تھا۔

''پتہ نہیں چھوٹے لالہ کو خبر ہوئی کہ نہیں۔ اجن ماموں کو بڑی فکر تھی۔ نوکروں کو تو پولیس باندھ لے گئی ہوگی۔'' انوکھے لال ساتھ ہی واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے جیسے تسلی دی۔ ''ضرور ہو گئی ہوگی۔ اپنی موٹر ہے۔ جلدی ہی پہنچیں گے۔'' دو چار لوگ اور آ گئے۔ اس دن اتفاق سے اتوار تھا۔ کچہری بند تھی اور زیادہ تر دوکانیں بھی۔ اجن ماموں کے بیٹھکے میں احباب کا جمگھٹ ہر چھٹی کا معمول تھا لیکن آج کسی نے نہ پنڈت نہرو کی حالیہ تقریر پر گفتگو کی نہ سیاست اور قومی آواز کے ایڈیٹوریل زیر بحث آئے نہ کسی بزرگ نے طلبا میں بڑھتی بے راہ روی پر تشویش کا اظہار کیا نہ ہی رُوئی کے مقامی تاجر میاں عبدالسلام پر چھینٹے کسے گئے جو ایک بار میونسپلٹی کے الیکشن میں کامیاب ہو گئے تھے تو ایم۔ پی بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ جاہل نمبر ایک۔ مستیا کبابی کی دوکان کے تھڑے پر بیٹھ کر کباب کھاتے اور چائے سُڑ کتے۔ اجن ماموں نے اپنی خالص ذاتی تھیوری کے مطابق (کہ فرائڈ اور ینگ جیسے حضرات سے ان کی واقفیت قطعی نہ تھی) ان کی شخصیت کی درجہ بندی 'احمق فتنین' کے تحت کی تھی یعنی وہ شخص جو مزاجاً فتنہ پرداز ہو لیکن حد درجے کا احمق ہونے کی وجہ سے فتنے کھڑے کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے......لو میاں۔ اب ایسے ایسے ہمارے ممبرانِ پارلیمنٹ ہوں گے سالے......قہہ قہہ قہہ......اجن میاں کے بیٹھکے کے دسیوں طاق قہہ قہوں سے بھر جاتے اور ان میں رکھے کاغذی پھولوں کے گلدان الٹ الٹ پڑتے۔ موکھوں میں بیٹھی گوریاں پُھر پُھر کر کے اڑ جاتیں۔ لیکن آج اجن ماموں کی بیٹھک میں کوئی قہقہہ نہیں گونجا۔ طاق میں رکھے کاغذی پھولوں کی پنکھڑیاں ذرا نہ ہلیں۔ گوریاں موکھوں میں ساکت بیٹھی رہیں کہ ان سب پر سانسیں بھی بڑی آہستگی کے ساتھ دستک دے رہی تھیں کہ شہر کے بازار میں ایک قتل ہو

گیا تھا — صرف ایک قتل۔

ملازمہ کئی بار آکر پردہ ہٹا ہٹا کر بیٹھکے میں جھانک چکی تو کوئی تین بجے اجن ماموں اندرونِ خانہ تشریف لے گئے۔ عذرا بیٹا جن کی وجہ سے اجن ماموں جگت ماموں بن گئے تھے جلدی سے حسبِ معمول اپنے اسکول کی روداد سنانے کو دوڑیں لیکن آج ان کی آواز میں جوش و خروش نہیں بلکہ خوف، حیرت اور تاسف کی ملی جلی کیفیت تھی۔

''ماموں۔ آج ہمارے ڈرائیور نے وہاں بس روکی۔'' پھر وہ چپ ہوگئیں

''کہاں بیٹا؟''

''وہیں جہاں ایک بوڑھے آدمی کا قتل ہوگیا ہے''

''وہ بابو ہر پرشاد تھے بیٹا۔ اور ہاں تم نے کھانا کھایا؟''

''آپ نے نہیں کھایا تو ہم کیسے کھالیتے ماموں۔ اور ماموں وہ لالہ ہر پرشاد......''

''ہاں بیٹا۔ لالہ ہر پرشاد...... دیکھو جاؤ ذرا ممانی کا ہاتھ بٹاؤ اور جلدی سے کھانا لگوادو...... میری وجہ سے تمہیں بھی دیر ہوگئی۔ تمہیں کھالینا چاہئے تھا۔'' انہوں نے بیوی کو آواز دی ...... ''عذرا کی ممانی......'' وہ دوڑی ہوئی آئیں۔'' آگئے آپ...... سنا ہے بابو رام پرشاد کی حویلی میں۔......''

''ارے بھائی پھر پوچھ لینا...... بچوں کے سامنے یہ قتل و غارت گری کی باتیں...... جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔ اور کھانا لگواؤ۔ عذرا بھوکی ہوگی۔'' پھر زیرِ لب بولے۔'' گرچہ کیا کھانا کھایا جائے گا وہ معلوم ہے۔ ایسا جی خراب ہوا ہے سُن کر۔''

''سو تو ہے۔'' ممانی نے تائید میں سر ہلایا۔ اور کئی ہفتوں تک ہلاتی رہیں کہ ان سے ملنے والی ہر عورت اور ماموں کے بیٹھکے میں آنے والے ہر مرد کی گفتگو 'کیا زمانہ آن لگا ہے' کے ٹیپ کے بند سے شروع ہوتی اور اسی پر ختم ہوتی تھی۔ پھر یہ گردان کرتے کرتے اجن ماموں کا زمانہ ختم ہونے لگا۔ ان کے بیٹھکے کا پلاسٹر اور ان کے تمام ساتھیوں کا کلف جھڑ گیا۔ وہ سب کے سب ڈھیلے ڈھالے سے گردن لٹکائے، بیٹھے اپنی دھندلی ہوتی ہوئی آنکھوں سے سامنے کی دنیا کا منظر دیکھ رہے تھے۔ دنیا جو قتل، و غارت گری کا ایک مہیب کولاج بنتی جا رہی تھی اور جس سے انہوں نے عذرا کو دُور رکھنا چاہا تھا۔ قصبے میں بیک وقت ایک ہی کنبے کے گیارہ افراد کا قتل۔ بغل

کے ضلع کے گاؤں میں ایک ذات سے تعلق رکھنے والے چوبیس آدمی مار گیئے ۔شمال مشرق میں ایک مخصوص قبیلے کے پورے گاؤں کا صفایا۔ پٹھانوں کی اس بستی میں اوسطاً روزانہ دو آدمیوں کا قتل ۔ پچھلے چند ماہ کی کُل تعداد ایکسو ساٹھ ۔ گھاٹی میں آج پولیس کے دو جوانوں سمیت بتیس آدمیوں کی موت......

اس کولاج میں چِپکے اخبار کے تراشے دھرتی سے آسمان تک پہنچ رہے تھے......اجن ماموں نے اپنی دھندلاتی آنکھوں سے بہتا پانی پونچھا اور لاتعلق سے دروازے کی طرف دیکھا......مگروہ لاتعلق نہیں رہ سکے اس لیے کہ عذرا کا سب سے چھوٹا بیٹا جو ماشاء اللہ سے خاصہ بیس برس کا تھا ان کے بیٹھکے میں داخل ہو رہا تھا۔ اجن ماموں خفا ہوکر غرّ ائے۔بوڑھے شیر کی غرّ اہٹ۔

''کہاں سے چلے آرہے ہو میاں۔ برف کٹ رہی ہے اور موٹر سائیکل پر اُڑے اُڑے پھرتے ہو۔اور وہ ہلمٹ کہاں ہے تمہارا؟''

''ماموں،میں ابھی سلام چوک کی طرف سے آرہاہوں۔''اس کی آواز کچھ سنجیدہ تھی۔

ماموں کے سارے دانت جھڑ چکے تھے۔اس لیے انہوں نے دل ہی دل میں دانت کٹکٹائے۔کوئی سلام چوک کا نام لیتا تو ان کے اندر کی ایسا ہی ردّعمل پیدا ہوتا تھا۔میاں عبدالسلام کا بیٹا بے وقوف فتین نہیں تھا۔فتنہ اس نے باپ سے ورثے میں پایا تھا اور چالاکی گرد و پیش کے تیزی سے تبدیل ہوتے منظرنامے سے۔وہ لوگوں کو نقصان پہنچانا چاہتا تو حماقت اس کے آڑے نہیں آتی تھی۔سلام میاں ایم۔پی نہ سہی۔ مقامی ایم۔ایل۔اے تو بن ہی گئے۔ان کی اس کامیابی میں بیٹے کا بڑا ہاتھ تھا۔اس نے اور کامیابیاں بھی حاصل کیں۔جن میں ایک یہ بھی تھی کہ باپ کو ایک عظیم ہستی ثابت کر کے ان کے نام پر شہر کے چوک کا نام رکھوادیا۔

''وہاں کہاں مٹر گشتی کر رہے تھے۔ جاڑوں کی رُت۔اندھیرا کتنی جلدی اترتا ہے۔ اور ٹھنڈا لگ۔''

لڑکے نے سوال کا جواب نہیں دیا۔ذرا رُک کر بولا ماموں میں نے اپنی آنکھوں سے ایک قتل ہوتے دیکھا۔اس کے موہنہ سے نکلے ہوئے الفاظ دیر تک ہوا میں کانپتے رہے۔

تم نے؟ تم نے ایک قتل ہوتے دیکھا...... ماموں نے بیزاری سے اس پر ایک اچٹتی

ہوئی نظر ڈالی...... پھر جیسے یکا یک وہ ہوش میں آ گئے۔ خاموش! انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ان کی آواز کسی سانپ کی پھپھکار سے مشابہہ تھی۔

''ماموں۔اس نے بات جاری رکھی۔ میں سلام چوک کے پٹرول پمپ پر رُکا تھا۔ دو لڑکے موٹر سائیکل پر آئے۔ انہوں نے پٹرول لیا۔ کیشئر سے ریز گاری پر کچھ تکرار ہوئی۔ لڑکوں نے اسے گالی دی۔ کیشئر گالی پر ہتے سے اکھڑ گیا۔ جواب میں اس نے بھی گالی دی۔ لڑکے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر چکے تھے۔ اچانک ایک بولا...... 'ماردوں کیا سالے کو؟'

'جانے دے یار۔ چل۔ دیر ہو رہی ہے۔' دوسرے کا جواب تھا

'نہیں یار مار ہی دیتا ہوں۔'

اس نے انجن بند کر دیا۔ دوبارہ اندر گیا۔ چمڑے کی جیکٹ کے اندر سے ریوالور نکالا اور کیشئر کو گولی مار دی۔ ماموں......'' الفاظ پھر ہوا میں کپکپانے لگے تھے۔

''انہوں نے تمہیں...... میرا مطلب ہے وہ تمہیں پہچانتے تو نہں......''

میں اندھیرے میں تھا۔ دوسرے انہیں کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخر وہاں اسٹاف کے دو آدمی تو تھے ہی۔ چند قدم دُور چوراہے پر کانسٹیبل بھی تھا۔

میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔ ماموں کا جُملہ مختصر تھا اور لہجہ سخت و سپاٹ۔

''میں محفوظ ہوں ماموں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں تو بس یہ سوچ رہا ہوں کہ میری آنکھوں کے آگے ایک شخص مارا گیا۔ ماموں بس چند منٹ قبل وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ تندرست و توانا جوان آدمی۔ بھاپ نکلتا چائے کا کوزہ چھوکرے نے اس کے سامنے بس لا کر رکھا ہی تھا۔'' وہ ایکدم سے خاموش ہو گیا۔

اجن ماموں کی چہیتی عذرا کا سب سے چہیتا، سب سے چھوٹا، نو جوان بیٹا محفوظ ہے۔ انہوں نے اطمینان سے مچپاتی آنکھیں بند کر لیں۔ آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ اس گھر کے اندر کم از کم، اس دن، اس لمحے ان کے سارے عزیز بخیر و محفوظ تھے۔

''اس نے اسے کیوں مارا؟ کیا مارنے والا جلاد تھا اور مقتول کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی؟''

اجن ماموں کے بیٹھکے کے طاقچوں میں رکھے کاغذ کے بوسیدہ پھولوں نے باہم سرگوشی کی اور کہا ''نہیں۔''

"کیا مارنے والا سپاہی تھا اور مقتول میدانِ جنگ میں دشمن کی فوج کا کوئی آدمی"

"نہیں"

مارنے والا اگر نہ مارتا تو کیا خود مارا جاتا کہ مقتول اس کے گھر میں گھس آیا تھا اور اس کے ہاتھ میں ہتھیار تھے اور نیت میں فساد؟"

"نہیں"

کیا مارنے والا قصاب تھا اور مقتول ایک جانور جس کا ذبح کیا جانا جائز اور مستعمل ہے کہ وہ انسانوں کی غذا بنا کر اتارا گیا ہے؟

نہیں۔نہیں۔اور نہیں۔

اس نے بغیر حکمِ سلطانی، بغیر کسی جنگ کے، اس سے بغیر کسی جان مال کے خطرے کے، اس کے گھر میں گھس کر مارا اس لیے کہ وہ بلا قصور گالی کھانے کا متحمل نہ ہو سکا تھا اور جواب میں گالی دے بیٹھا تھا جس کا اسے پورا حق پہنچتا تھا ـــــــ اور وہ جانور نہیں تھا۔ایک انسان تھا۔نیک، بے ضرر رسا عام آدمی۔

"اور اس دن، اسی صبح کہیں انہوں نے سیکڑوں لوگوں کو ان کی جھونپڑیوں میں زندہ جلا دیا تھا، ان کا گوشت پکا کر، کتوں کے دستر خوان پر سجایا تھا۔"

اجن ماموں نے اخبار کرسی کی پشت پر، بیچ سے کھول کر اپنی شیروانی کی طرح لٹکا دیا ہے۔پھر اپنے نواسے کا چہرہ چھو کر دوبارہ اطمینان کی سانس لی ہے۔اس دن اس لمحے ان کے سارے عزیز محفوظ تھے اور اب لوگ لمحوں میں جیا کرتے ہیں۔

بیٹا۔اپنی ممانی سے کہو چائے بھجوا دیں۔وہ انوکھے لال بھی آتا ہی ہوگا۔ماموں ٹھہری ہوئی آواز میں کہہ رہے ہیں۔ان کا بیٹھکہ پرسکون ہے اور کسی لنگر انداز جہاز کی طرح ساکت بھی۔لہروں کے تلاطم سے اب اس میں زلزلہ نہیں آتا۔

اجن ماموں بڑھ کر آتشدان میں تھرتھراتے ہاتھوں سے ایک لکڑی اور ڈالتے ہیں۔
شکر ہے مالک۔شکر ہے مالک۔ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر تیزی کے ساتھ چلنے لگتی ہیں۔

☆☆

افعیٰ

انجینئرنگ کالج میں داخلوں کا سلسلہ جاری تھا۔ داخلے کے امتحان میں کامیاب طلبا کو انتظامیہ کی طرف سے خط جاری کر دیے گئے تھے۔ پندرہ دن کے اندر انہیں داخلہ لے لینا تھا۔ اکیڈیمک سیکشن میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ ہر سال کا معمول تھا۔ تعلیمی سال شروع ہوا اور فریشرز آئے۔ کچھ سال پہلے کسی ستم ظریف نے ان کے لئے ''فچے'' کی اصطلاح وضع کی تھی۔ فچے یعنی فریشر بچہ۔ اصطلاح نہایت مقبول ہوئی۔ اکیڈیمک سیکشن کے کلرک تک اب نئے آنے والے طلبا کے لئے نہایت روانی کے ساتھ فچہ اور فچی استعمال کرتے تھے۔

زیادہ تر فچوں کے ساتھ ان کے والدین بھی آیا کرتے تھے۔ سب کے چہروں پر خوشی کی ایک چمک ہوتی تھی۔ ایڈمشن انچارج دھن راج ورما کی اس چمک سے بھی پرانی جان پہچان تھی۔ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونا آسان نہیں ہے۔ ہزاروں طلبا بیٹھتے ہیں بلکہ شاید لاکھوں اور منتخب محض تین سو ہوتے ہیں۔

کافی طویل وعریض کمرہ تھا۔ اس میں کئی کلرک تھے۔ ایک جگہ سرٹیفکٹ جمع کیجئے۔ دوسری جگہ سے فارم لیجئے۔ تیسری جگہ خانہ پُری کے بعد اسے جمع کیجئے، چوتھی جگہ......

کمرے کے باہر وسیع کاری ڈور۔ دھن راج نے کھڑکی کے باہر نظر ڈالی۔ سات آٹھ طلبا کا ایک گروپ ڈولتا نظر آیا۔ ان کا یہاں کوئی کام نہیں تھا۔ یہ سب سینئرز تھے۔ ان کی پشت پر ایک مشہور کمپنی کے قیمتی بیگ تھے۔ پیروں میں اس سے بھی قیمتی جوتے اور وہ نہایت عمدہ اور ڈور

سے ہی شاندار لگنے والی جینز اور ٹی شرٹس میں ملبوس تھے۔ دھن راج مسکرایا۔ وہ سب کے سب چیونگم چبارہے تھےاور ہونٹوں پر دبی دبی شیطانی مسکراہٹ لیے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

''سالے۔ شکار کی تلاش میں ہیں۔'' دھن راج نے پیار سے زیرلب گالی دی اور رجسٹر میں خانہ پُری کرتے کرتے سوچنے لگا کہ پچھلے سال ان سب حرامزادوں کی اپنی ریگنگ (Ragging) ہوئی تھی۔ وہ بھول گئے اور پہنچ گئے نئے آنے والوں کو تنگ کرنے۔ ابھی ان غریبوں کی ایڈمشن کی کارروائی تک پوری نہیں ہوئی ہے۔ اتنا صبر نہیں کہ ایڈمشن لے کے یہ کلاس تو شروع کریں۔

اکاؤنٹنٹ انصاری بڑا سخت مشہور تھا۔ لڑکوں کا اس سے سابقہ بھی زیادہ پڑتا تھا۔ وہ باہر نکل آیا اور اس نے سینئر طلبا کو ڈانٹا۔ آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ تشریف لے جایئے۔ فی الحال۔

کیا گرو! آپ کو کیا پریشانی ہورہی ہے عبدالواحد انصاری سر! ایک لڑکے نے انصاری کے کاندھوں رہاتھ رکھے۔

''میاں، یہاں کیوں بھیڑ بڑھا رکھی ہے۔ جاؤ آگے بڑھو۔ کلاس چھوڑ کر بھاگے ہے ہوئے ہو......''

نہیں سر ! ایسا ہوسکتا ہے سر ! برجیش نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ اس کی آواز میں ہنسی کی کھنک تھی۔

بھاگ لو۔ ورنہ انصاری سر پیٹ بھی دیا کرتے ہیں۔ سُمیت نے کہا اور آگے والے لڑکے کو دھکا دیا۔

انصاری نے ایک مصنوعی قہر آلود نگاہ ان پر پھینکی اور نئے لڑکوں سے کہا'' بیٹا آپ لوگ اندر رہیے ورنہ ابھی یہیں ریگنگ شروع ہوجائے گی۔ یہ سب سے بدمعاش لڑکوں کا گینگ ہے۔'' فچوں کے چہروں سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

اگلے سال شاید میرا بیٹا بھی یہاں آئے۔ انصاری نے دوبارہ رجسٹر پر جھک کر سوچا۔ ہندی میڈیم سے پڑھا ہوا لڑکا ہے۔ صوبائی بورڈ سے آئی ایس سی کر رہا ہے۔ اوسط درجے کی ذہانت ہے۔ صُوبائی اداروں میں اوسط اور غبی بچے بالکل ہی ناکارہ ہو جاتے ہیں جبکہ اچھے

انگریزی اسکولوں میں پڑھایا جائے تو معمولی درجے کی ذہین بچوں کی صلاحیتوں پر بھی ایسی جلا آتی ہے کہ وہ بڑے تکنیکی اور پروفیشنل کالجوں میں داخلہ پانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ پچھلے پندرہ سالوں میں یہ رجحان بہت اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ پہلے ورنا کیولر اسکولوں کے پڑھے ہوئے طلبا بھی خاصی تعداد میں دکھائی دیتے تھے۔ لیکن اب تو زیادہ تر انگریزی بولنے والے، جینز اور مہنگے اسپورٹس شوز میں ملبوس اسمارٹ بچے ہی آتے ہیں۔ لڑکیاں بھی خاصی تعداد میں آنے لگی ہیں۔ پوچھو بھلا تمہیں انجینئر بن کر کیا کرنا۔ لڑکوں کا حق کیوں مار رہی ہو۔ انہیں تو کنبہ پالنا ہے۔ روزی روٹی چلانی ہے۔ بیوی بنا کر تمہیں ڈھونا ہے۔ تم اپنی تنخواہ سے مہنگا میک اپ خریدوگی شوہر کے مونہہ کو آوگی کہ تم اس کے برابر تنخواہ لاتی ہو۔ سوچتے سوچتے انصاری کو محسوس ہوا جیسے اس کے بیٹے کی سیٹ پر کوئی لڑکی ہی قابض ہونے والی ہے۔

کوری ڈور سے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا اور پھر آواز دُور ہوتی چلی گئی۔ انصاری کی سرزنش کے بعد سارے سینئرز ہاہا کرتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

سامنے وسیع اور سرسبز میدان تھا۔ پیڑوں کے ایک جھرمٹ سے وانی نمودار ہوئی۔ ساتھ میں شلپا بھی تھی۔ سمیت کی نظر پڑی تو اس نے دُور ہی سے ہانک لگائی ......واء......نی...... ای......ای اے ذرا رُک میری اماں ۔ وانی اور شِلپا ہنستی ہوئی قریب آئیں۔ سمیت نے آستینیں چڑھائیں اور آنکھیں نکال کر وانی کی طرف دیکھا۔ ’’کیوں بے۔ یہ کیا بدتمیزی ہے؟‘‘

کیا؟ وانی نے بے خبری کا مظاہرہ کیا۔

دیکھ اگر معصوم بنی ہے تو پیٹ کے دھر دوں گا۔ ودِیا سے کیا لگائی بُجھائی کی ہے تُو نے۔

شِلپا مارے ہنسی کے کھڑی کھڑی ہی ہلنے لگی۔

’’میں کیوں کرنے لگی لگائی بُجھائی۔ تمہارا آپس کا معاملہ ہے۔ دو محبت کے ماروں کا پیار بھرا جھگڑا۔ میں بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ کہو تو ودِیا کو سمجھانے کا کام ضرور کر سکتی ہوں۔‘‘

وانی بے حد سنجیدہ تھی لیکن اس کی گہری بُھوری آنکھوں میں تتلیاں سی پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ دراصل وانی بے حد شریر لڑکی تھی۔ جھگڑے لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ودِیا اور سُمیت کی گہری دوستی میں جذباتی رنگ اُجاگر ہونے لگے تھے۔ بس وانی نے جا کے کہہ دیا کہ سُمیت کی تو بچپن کی محبوبہ اس کے وطن میں موجود ہے۔ شادی اسی سے کرے گا۔ یہاں ہوسٹل میں تفریح کر رہا

ہے۔ سمیت کی بچپن کی محبوبہ 'ایجاد' کرنے کے بعد وانی نے اس کا ایک نام بھی تجویز کر دیا تھا 'شمپا'۔ پھر اس نے ایک اور چکر چلایا۔ ایم تھری (منیش موہن اگروال کا نام اس کے شہر کی مناسبت سے پہلے منیش موہن مراد آبادی اور پھر اس کا مخفف ایم تھری کر دیا گیا تھا جواب اس سے پوری طرح چپک گیا تھا) سے جا کے کہہ دیا کہ وِدّیا اور سمیت کا جھگڑا ہو گیا ہے اور وِدّیا ایم تھری کے 'پروپوزل' پر غور کرنے کے لئے تیار ہے۔ منیش جو مراد آبادی ایک برتن بنانے والی فیکٹری کے مالک کا بیٹا اور لڑکیوں کے معاملے میں خاصہ بے وقوف تھا وِدّیا کے چاروں طرف منڈلانے لگا۔ وِدّیا کی سمیت سے گہری دوستی کے باوجود ابھی تک کسی قسم کے عہد و پیمان نہیں کئے گئے تھے۔ ادھر 'شمپا' کی دریافت اور ادھر یہ کہ صنفِ مخالف کی توجہ تو سبھی کو اچھی لگتی ہے وِدّیا ایم تھری کی خصوصی عنایتوں سے خاصی خوش ہولیا کرتی تھی۔ ویسے بھی یہ سب آج کل کی نوعمر لڑکیاں تھیں۔ لڑکوں سے شرما کر اُوئی اللہ یا ہائے رام کہہ کر مونہہ چھپانے اور جوتی چھوڑ کر بھاگ نکلنے کے واقعات ان کی اماں نہیں بلکہ نانی دادی کے وقتوں کے ہو چکے تھے۔ بہر کیف پچویشن کسی ہندی فلم جیسی گورکھ دھندا تھی اور وانی کوشش کر رہی تھی کہ سُمیت سنگھلا سے جسے وہ سُمیت بارہ سنگھا کہا کرتی تھی دُور ہی دُور رہے لیکن آج بارہ سنگھے نے اسے دھر ہی لیا تھا۔

''وِدّیا کو کیا سمجھائے گی تو خبردار جو وِدّیا سے کچھ بھی کہنے کی کوشش کی'' سُمیت نے پھر آنکھیں نکالیں۔

''لو جی۔ وِدّیا تمہاری بیاہتا ہے کیا کہ اس پر یہ پابندی لگاؤ گے کہ وہ کس سے ملے اور کس سے نہ ملے۔''

اب کی شِلپا سے نہیں رہا گیا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ خاصہ زوردار مردانہ سا قہقہہ۔ پھر دونوں وہاں سے بھاگ نکلیں۔ کچھ دُور سے وانی نے پلٹ کر سُمیت کو دیکھا۔ اس کا چہرہ شرارت سے گلنار تھا۔ یہ عورتیں۔ شتر وگھن نے دانت پیسے۔ یہ کبھی نہیں سُدھریں گی۔ کہتی ہیں برابر کا حق چاہئے۔ ارے سر پر تو پہلے سے چڑھی بیٹھی ہو۔ اب اور کون سی برابری چاہئے۔ جتنی دکھائی دے رہی ہیں یہ سب تمہاری ناک کاٹ کے ہتھیلی پر دھر دیں اور تم خود کو ان کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے پاؤ۔ اچانک وہ لڑکیوں کو بھول کر چلایا...... ''ارے یار دیکھ...... دیکھ......'' اس کی آواز میں کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے کہ شکاری کو ہرنوں کی ڈار دکھائی دے گئی ہو۔'' وہ فَچے جا رہے ہیں پَرا بنا کے۔

سالے فارم وارم بھر کے نکلے ہیں۔ تھوڑی تفریح ابھی ہی ہو جائے۔''

انہوں نے ایک لڑکے کو جا پکڑا۔ سُمیت بارہ سنگھے نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا۔

''کیوں بے نام کیا ہے تیرا؟''

''امیت کھنہ......'' بڑی مسکین سی آواز میں لڑکے نے جواب دیا۔

''باپ کا نام؟''

''باپ کے نطفے سے ہے بھی یا نہیں؟'' کسی نے لقمہ دیا اور باقی ہو ہو کر کے ہنس پڑے۔ لڑکے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''اچھا خیر۔ جسے باپ کہتا ہے، مطلب یہ کہ جس کے ساتھ تیری ماں کی شادی ہوئی ہے اس کا نام کیا ہے؟'' ایک اور لڑکے نے سوال کی وضاحت کی۔

''نیک چند کھنہ''

۔ بڑا بدتمیز ہے یہ تو۔ باپ کہتا ہے اور نام یوں ہی لے دیتا ہے۔ ابے باپ ہے یا تیرا نوکر۔ نام میں صاحب، مسٹر کچھ تو لگانا تھا۔ برجیش نے امیت کھنہ کو کس کے ایک جھاپڑ لگایا۔ اس کے کان جلنے لگے۔ دُبلا پتلا لڑکا۔ دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لئے کچھ زیادہ ہی لاڈلا تھا۔ ایک ہی تھپڑ میں بسورنے لگا۔

ابے بول پھر سے۔ باپ کا نام کیا ہے؟

اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا...... شری نیک چند کھنہ صاحب۔

''واہ واہ صاحب...... ذرا صاحب کی اولاد کو تو دیکھو۔ ابے نیک چند کھنہ لاٹ صاحب کہنا تھا تجھے تو۔'' ایک دھول اور پڑی۔ ''چہ پدی چہ پدّی کا شوربا۔ بیٹا تمہاری سزا یہ ہے کہ یہاں کھڑے رہو سارا دن اور جتنی لڑکیاں یہاں سے گذریں ان میں سے ہر ایک کے پاس جاؤ اور کہو تو میری اماں تو میری بہن۔''

اسی وقت ہر پریت وہاں آ نکلا۔

''ارے ان فچوں کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟ ذرا اطمینان سے پالو۔ کچھ کھلی سانی کرو۔ پھر دیکھیں گے۔ پھنسے ہیں سالے جائیں گے کہا......''

''تجھ پہ کیا مصیبت ٹوٹ رہی ہے۔ تیسرے سالے لگتے ہیں کیا؟'' سُمیت نے ہر

پریت پر قہر آلود نگاہ ڈالی۔

''یار میری فیس نہیں جمع ہو رہی ہے۔ ٹرمینل کا رزلٹ رُک جائے گا۔ چل ذرا آفس۔'' ہر پریت نے پرس لہرایا۔

''تیسرا باپ ہر مہینے موٹا منی آرڈر بھیجتا رہتا ہے۔ فیس کیوں رُکی؟''

''پی گیا ہوگا سالا۔ یوتھ فیسٹول کے دوران مسلسل ٹلی ہوا ہوا تھا۔'' ایک آواز اُبھری

''اور وہ جو رُڑکی سے لونڈیا آئی ہوئی اسے ہفتے بھر ٹہلایا اس نے۔ یار دوست بھابھی کہنے لگے تھے۔ ابے چلتے وقت انگوٹھی پہنا دی کیا؟''

ایسی پخ نہیں پالتے مابدولت۔ ہر پریت ہنسنے لگا۔ یاروں کو تو کئی بھابھیاں دے رکھی ہیں میں نے۔ اتنے میں ایک لڑکی ادھر گذری۔ لانبی چھریری۔ معلوم ہوا کہ ہوا پہ تیر رہی ہے۔

ابے دوڑ۔ سُمیت اور برجیش ایک ساتھ چلائے۔

امیت کھنہ بادلِ نخواستہ جگہہ سے ہلا۔

'ابے دوڑ' لڑکے پھر بولے۔ ''پکڑ اسے۔ جا کہہ۔ تو میری اماں، تو میری بہن......''

امیت لڑکی کے پاس جا کے ہکلانے لگا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بڑی مبہم۔ آنکھوں میں گہری اور ہونٹوں پہ ہلکی۔ امیت کو وہ بہت خوبصورت لگی۔ اس نے جھک کر اس کے پیر چھوئے۔ وہ باقاعدہ ہنس پڑی۔ اس وقت تک غول پاس آ گیا تھا۔

''کیا کہا اس نے ؟''

ابھی تک تو کچھ بھی نہیں کہا۔ لڑکی نے جواب دیا۔ وہ مسلسل ہنس رہی تھی۔

کیوں نہیں کہا؟ تین چار دھولیں اس کے سر پر بیک وقت پڑیں۔ وہ تقریباً رکوع میں چلا گیا اور تُو میری اماں تُو میری بہن کی تکرار شروع کی تو طوطے کی طرح بولتا ہی چلا گیا۔

ایسی خوبصورت لڑکی کی یہ توہین کہ کوئی جوان پٹھا اس سے کہے کہ تو میری اماں، تو میری بہن۔ لڑکے چلائے اور پھر گھونسے تانے۔

''جانے دو۔ جانے دو۔ لڑکی کو امیت کا روہانسا مونہہ دیکھ کر ترس آ گیا تھا۔ ایسے چڑی مار کی تو ماں بہن بننے میں ہی عافیت ہے۔ آئی ایم شیور، اس کی اماں اسے پیدا کر کے خاصی شرمندہ ہوئی ہوگی۔''

وہ سب قہقہہ لگا کے ہنسے۔ لڑکی انہیں ٹاٹا کرتی ہوئی نکل گئی۔

یہ لڑکیاں کیسی کیسی باتیں کرنے لگی ہیں۔ امیت چھوٹے شہر سے آیا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ تو دہلانے والا تھا ہی۔ اب یہ لڑکی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اپنی بہنیں کسی لڑکے سے اس طرح بات کر سکتی ہیں۔

''تاؤ۔ کھڑے رہو یہاں۔ خبر دار جو ہلے ہو۔ ہم آ کے چیک کریں گے۔ یہاں نہ پائے گئے تو اُلٹے استرے سے حجامت بنا دیں گے۔'' غول دھمکی دے کر آگے بڑھ چلا۔

سامنے سے ایک اور فریشر چلا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک سینئر لڑکی بھی تھی۔ فریشر نے سرخ رنگ کی اسپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی اور پھیکی آسمانی جینز۔

''کیوں پٹھے' یہ کیا پہن رکھا ہے؟'' وہ اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کے پڑے

''ابے یہ انجینئرنگ کالج ہے یا پُونا کا فلم انسٹی ٹیوٹ۔''

سالا۔ لڑکی نے اطمینان سے یہ سوچے سمجھے بغیر کہا کہ رشتے میں کوئی اس کا سالا کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے پرس سے سگرٹ کی ڈبیا برآمد کی۔ ''یہ رنگ تو میں اپنے پھیروں میں بھی نہ پہنوں۔'' اس نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''پھیروں میں تو تُو ماتمی رنگ پہنیو...... ایک سینئر ہنسا۔ جس سے بیاہ ہوگا وہ سالا دوسرے ہی دن ٹیں...... ایں......

لڑکی نے ایسا کہنے والے ہم جماعت کو ایک لات ماری۔ نہایت لانبی پتلی سڈول لات۔ امیت کی تو گھگھی بندھ گئی۔ ابھی اس سے بھی کہنا ہوگا تُو میری اماں، تُو میری بہن۔ نہ جانے کیا سُلوک کرے گی۔ اب کیا لڑکیوں کی لاتیں بھی کھانی ہوں گی۔ لیکن سینئرز کی توجہ اب اس سُرخ اسپورٹس شرٹ والے لڑکے کی طرف ہو گئی تھی۔

''نام کیا ہے بے؟'' بے کے آگے ایک موٹی سی گالی بھی تھی۔ لڑکا ذرا کی ذرا ابل گیا۔

''سنجر۔''

ابے سنجے کے آگے پیچھے کچھ نہیں۔ خالی سنجے؟

شڈ ہوگا سالا۔ لڑکی نے کہا...... یہ لوگ آج کل سرنیم نہیں لگا رہے ہیں۔

''ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے یہاں شیڈیول کاسٹ ہوتی ہی نہیں ہے۔''

''کیا کہا؟ ذرا پھر سے بول۔ سالا مُلا ہے۔'' ایک لڑکا بولا۔

''ابے یہ مُلا سنجے نام کب سے رکھنے لگے؟'' دوسرے نے لقمہ دیا۔

''۹۲ء میں اتنی پٹائی ہوئی کہ یہ دھوکہ باز نام تک بدلنے لگے۔''

''کیا پتہ جھوٹ بول رہا ہو۔ پاجامہ کھلواؤ۔ پاجامہ......

''اور جو کٹوانا بھی بند کر دیا ہو تو؟'' ''ہاہاہا......'' ایک فلک شگاف قہقہہ گونجا۔

لڑکے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔'' ہمارا نام سید سنجر علی ہے۔ یہ نام ہمیشہ سے ہمارے یہاں ہوتا چلا آیا ہے۔ سنجے نہیں سنجر......'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ کوشش کی کہ غصہ اور جھنجھلاہٹ آواز سے عیاں نہ ہوں۔ ہم اپنی شناخت چھپاتے نہیں ہیں۔''

''بڑا ڈھیٹ ہے یار۔ اب کیا اپنی شناخت بھی دکھادے گا۔''

''اس کی پوری قوم ڈھیٹ ہے۔''

یار یہ تم لوگوں نے کیا شروع کر دیا۔ لڑکی نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ ان باتوں کی کیا تک ہے۔ یار ذرا ڈیلیسی برتو۔

ہاہاہا......Appeasement......کون سے دَل کی ہے یار؟ ایک لڑکے نے کہا۔

اس کا باپ جے۔ این۔ یو میں ریڈر ہے۔ سُوڈو انٹلیکچوئیلز کا گڑھ...... دوسرے نے لقمہ دیا۔

'بھاڑ میں جاؤ......'' لڑکی چڑھ کر سگرٹ کے لمبے لمبے سٹے لگاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

''بدتمیز کہیں کے۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔

سنجر نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔

ابے مُلا بھاگا دُم دبا۔ ایک نے تالی بجائی۔ جائیگا کہاں؟ پاکستان؟

''کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔'' سنجر جم کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا بولا تھا کہ ہمارے یہاں شدٗ نہیں ہوتے۔ کوئی چماری مسلمان ہو جائے تو شادی کرے گا اس سے یا جھوٹ مُوٹ کا جھانسہ دیتا ہے ان لوگوں کو۔''

سنجر کے جواب دینے سے قبل کوئی اور بول اٹھا۔'' چوتھی میں چماری بھی چلے گی۔ اسے تو چار کرنا ہیں ورنہ پینتیس بچے کہاں سے پیدا کرے گا۔ ہم پر ایک بار پھر غالب کیسے آئے گا۔''

حیران و پریشان سنجر پوری کوشش کر رہا تھا کہ زبان پر قابو رکھے۔ وہ فریشر تھا اور اس کی پوزیشن ابھی کمزور تھی۔ گھر والوں نے بھی سمجھا کر بھیجا تھا کسی سے الجھنا نہیں۔

''بولتا کیوں نہیں۔ اچھا بتا چھ دسمبر کو رویا تھا؟......

''نہیں۔'' اس نے مضبوطی کے ساتھ جواب دیا۔'' حادثے افراد کے ساتھ ہی نہیں قوموں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں۔......

''نہیں رویا تھا؟ ابے کیسا مُلا ہے تو؟ اب رُلائیں کیا؟''

''چھوڑ دے یار چھوڑ دے۔ متھرا اور کاشی کے بعد تو ضرور روئے گا۔ ابھی فلاسفی چھانٹ رہا ہے۔''

''ضروری نہیں کہ تب بھی روؤں...... ہو سکتا ہے......'' اس نے ہونٹوں سے دانت کاٹے۔

سگرٹ پینے والی لڑکی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ زیادہ دُور نہیں گئی تھی۔ سنجر کی آنکھوں میں الاؤ سا سُلگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے لڑکی کے خوش و خرم دکھائی دینے والے چہرے پر تفکر کی گہری لکیریں کھینچ گئی تھیں۔ یہ زہر۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ آخر تو سنجر کو اسی درسگاہ میں رہنا ہے۔ لیکن وہ کیا کرے۔

لڑکی پھر آگے چل پڑی۔

ایک مکوڑے کی موت

مِشر جی کوئی چوتھی مرتبہ آئے تھے

ابے چلے گا تو بول نام لکھ دوں۔ ورنہ صاف صاف کہہ دے۔ مار خوشامد کرا رہا ہے۔ اس کے بعد پھر نہیں آؤں گا، پرسوں پرستھان کر دینا ہے۔

ڈھینا نے پیلے پیلے دانت نِکو سے اور سر کھجانے لگا۔ گیہوں کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ کئی کھیتوں سے غلہ اٹھ گیا تھا۔ موسہر چماروں کے لونڈے سِلا بینتے دکھائی دیتے تھے۔ پھینکو نے آج ڈلیا بھر گیہوں کی بالیں اکٹھی کی تھیں۔ آدھا سیر غلہ ضرور نکل آئے گا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ تھوڑا اناج اور مل جائے تو... نہ جانے کب سے گھر کے سب لوگوں نے پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھائی تھی۔ کچھ دن پہلے ایک جنگلی خرگوش مل گیا تھا اور ہانڈی بھر گئی تھی۔ لیکن روز ایسا کہاں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو چوہے تک ہاتھ نہیں آتے۔ دو چار سے کام بھی نہیں چلتا۔ دونوں لڑکوں کے پیٹ میں جیسے بھُوت گھس گیا ہے۔ اماں کہنے کو بوڑھی ہے لیکن کھاتی تو سب کے برابر ہی ہے۔ اوپر سے ندیدی الگ ہوگئی ہے۔ ایک دن کہہ رہی تھی تھوڑا تیل چاہئے۔ یہاں نمک کے لیے تو پیسہ جُڑتا نہیں تیل مسالہ کہاں سے لایا جائے۔ گھونگھے اُبالو اور جنگل سے اکٹھا کئے کھر پتوار پر چوہے سینک سینک کر کھاؤ۔ بس ایک اس کی عورت ہے جو کچھ نہیں بولتی۔ پتھر جیسا چہرہ لیے دن بھر اِدھر اُدھر ڈولتی رہتی ہے کہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کچھ ایندھن اکٹھا ہو۔

''آٹھ روپے ملیں گے اور سربت اور پوڑی بھجی کھانے میں،' مِشر جی اٹھتے اٹھتے کہہ گئے تھے۔

ڈھینا کے ذہن میں دسترخوان سج گیا۔ ''پوڑی بھجی اور سربت۔'' مِشر جی جب بھی آتے دسترخوان سج جاتا لیکن ڈھنیا کو شہر سے ڈر لگتا تھا۔ اور اتنا لگتا تھا کہ من وسلویٰ کے لالچ پر

غالب آ جاتا۔ سُنا تھا سڑکیں اتنی چوڑی ہوتی ہیں کہ آدمی ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتے جاتے بولا جائے۔ پھر روشنی ایسی جیسی بجلی کڑ کنے کے وقت پل بھر کو ہوتی ہے۔ مہیب صورت گاڑیاں دوڑتی پھرتی ہیں۔ پتہ نہیں لوگ وہاں کیسے رہتے ہیں۔ ڈر سے مر نہیں جاتے۔

''کیسے رہتے ہیں لوگ یہاں؟ یہ سب ہیومن (Sub human) جاندار!'' ایک مرتبہ ڈھینا کے گاؤں کے بارے میں ایک عورت نے یہی سوال پوچھا تھا۔ پنجاب ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ سے چوہوں اور اسی قبیل کے دوسرے چھوٹے جانوروں پر ریسرچ کرنے والی ایک ٹیم نہ جانے کہاں سے بہتی بہاتی اس دُور افتادہ گاؤں میں آ نکلی تھی۔ اس میں دو لڑکیاں بھی تھیں۔ آٹھ مردوں کے بیچ دو جنانیاں — پتریا جیسی۔ نہ ماتھے پر گھونگھٹ نہ آنکھوں میں لاج۔ ڈھینا کا موہنہ کُھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ گاؤں کے بہت سے ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچے اور دو چار جوان جیپ کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ایسے عجوبے زندگی میں کبھی کبھی ہی دیکھنے کو ملا کرتے تھے۔ ان سب کے موہنہ کھلے ہوئے تھے اور چہرے پر انتہائی درجے کی حماقت عیاں تھی۔

کہاں کہاں گاؤں ہیں اور کیسے کیسے ویران۔ میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ جیسے کسی نے پنجرے میں بند کر دیا ہو۔ اُس جنانی نے دُوبارہ کہا۔ ڈھنیا کو وہ کچھ سڑی سی محسوس ہوئی۔ ایک تو عورت ہو کر اس نے مردوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال بھی چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ اس پر سے یہ بیانات۔ یہاں سے وہاں تک کھلی دھرتی۔ سر پر کھلا آسمان اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں۔ پیٹ بھرے، تن بھرے۔ کہاں رہتے ہیں اور کون دیتا ہے انہیں اتنا کچھ۔ ڈھنیا کا دماغ ان سوالوں کے جواب ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔

ٹیم کی رپورٹ کے مطابق علاقے میں چوہے حیرت انگیز حد تک کم تھے۔ جب کہ کھیتوں میں ان کے بیچ در بیچ بل موجود تھے۔ یہ لوگ چوہوں کی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ کیا یہ بھی چوہے کھاتے ہیں؟ ڈھنیا ہمت کر کے آگے بڑھا۔ صاحب کوئی ایسا طریقہ بتائیے جس سے چوہوں کی تعداد بڑھ جائے۔

اس ملک کا لاکھوں ٹن اناج چوہے کھا جاتے ہیں اور یہ کمبخت کہہ رہا ہے کہ چوہوں کی تعداد بڑھانے کی ترکیب بتائی جائے۔

صاحب یہ چوہے کھاتا ہے۔ ایک آدمی نے کہا۔

ہمارا پورا گاؤں کھاتا ہے۔ ڈھنیا نے سادگی سے جواب دیا۔

روڈنٹ (Rodent) کنٹرول کا ایک سادہ اور آسان طریقہ۔ انہیں کھا جایئے۔ ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر نفیس کو ہنسی آ گئی جو یوں بہت کم ہنسا کرتے تھے۔

''گورنمنٹ لاکھوں روپئے خرچ کر رہی ہے اور چوہے محققین کی ساری ترکیبوں کو دھتا بتا کر سارے زہر کھا کر اور ساری زہریلی گیسیں پی کر زندہ ہیں۔''

''بالکل ایسے ہی جیسے انسان چوہے کھا کر''

''ارے کیا چوہے کھانے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ آخ تھو'' اب کی بار اس عورت نے تھوکا۔ اسے متلی آنے لگی تھی۔ کیسی پاگل ہے۔ پندرہ بیس موٹے موٹے چوہے پکڑا جائیں اور کہیں دس پندرہ گھونگھے بھی چھان لیے جائیں تو اس دن ڈھنیا کے گھر ایک وقت کا جگاڑ ہو جائے گا مگر پوڑی بجی ---؟

ڈھنیا کا بیٹا پھیکو دس برس کا ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے کبھی پوریاں نہیں کھائی تھیں۔ دیکھی تک نہیں تھیں۔ شربت بھی نہیں پیا تھا۔ اور ننگا گھومتا تھا۔ بلکہ صرف دو برس پہلے تک پورا کا پورا ننگا۔ پچھلے دو سالوں سے ہی وہ ایک لنگھا باندھنے لگا تھا۔ مکھیا جی کی لڑکی کی شادی میں اس کی بیوی ڈھائی کوس کا راستہ چل کر دھان پھٹکنے گئی تھی۔ دو من کٹھل اس نے اکیلے بیٹھ کر درانتی سے چیرے تھے۔ تین دن لگاتار کام کیا تھا۔ اسے دونوں وقت بھر پیٹ کھانا ملا تھا۔ اور گاڑھے کی ایک دھوتی جسے پھاڑ کر اس نے چار ٹکڑے کیے تھے۔ اسی میں کا ایک ٹکڑا لڑکے کو ملا تھا۔ تین دن تک دونوں وقت بھر پیٹ بھات۔ واپس آ کر اس نے لوگوں کو بتایا تو ان سب کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ حسد کا شدید احساس ڈھنیا کو اندر تک کچوٹ گیا۔ مشکل یہ تھی کہ مکھیا جی نے صرف اس کی بیوی کو بُلوایا تھا۔ نہ ڈھنیا کو نہ اس کے بیٹے کو۔

وہ گیا ہوتا تو اتنا کھاتا، اتنا کھاتا کہ کئی دنوں کے لیے اس کی بھوک کو سکون مل گیا ہوتا۔ اس کی بیوی نے بتایا تھا کہ وہاں ایک وقت میں پانچ بوری چاول پکا تھا اور بھنڈار گھر میں بیسیوں بورے اناج کے رکھے تھے جن پر چوہے دندنا رہے تھے۔

ایک ٹھو بلا رپالے کا چاہی (ایک بلّا پالنا چاہیے) موٹے ٹھُل ٹھُل رسوئیے نے کہا تھا۔

''ارے بلروا سار کا مُوس پکڑیئے جَون ڈھینا موسہر پکڑ لی ہے۔ وہی کے بُلائے لیئ'' (بلّا

سلا کیا چوہے پکڑے گا جو ڈھینا موسہر پکڑے گا۔ اُسی کو بلا لو) رسوئیے کی مدد کرنے والے لڑکے نے کہا وہ سب استہزائیہ لہجے میں ہو ہو کر کے ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی میں تمسخر تھا اور گھن اور نفرت۔

حضرت انسان نے کوئی چیز کھانے سے نہیں چھوڑی۔ چوہے، چھچھوندر، سانپ، بندر، کتا، بکری، سُور، گائے، اونٹ۔ اور مزا یہ ہے کہ جو بکری کھاتے ہیں وہ گائے کھانیوالے سے نفرت کرتے ہیں اور وہ جو گیا ہضم کر جاتے ہیں وہ کسی سے چڑتے ہیں تو کہتے ہیں وہ فلانا سُور کھانا۔ اور وہ جو ڈھنیا کا مذاق اُڑا رہا تھا آدی باسی تھا اور گائے سُور سب کھا جاتا تھا۔ ایک بار اس نے ڈھینا کو چڑاتے ہوئے کہا تھا۔ اے مُوش کھاتا ہے مُوش...... نفرت کرنا، حقیر سمجھنا کتنا آسان ہے۔ بس اتنی سی بات کافی ہے کہ کوئی کیا کھاتا ہے۔ اب پوری سبزی ملے تو موس کاہے کو کھائے ڈھنیا۔ پوری سبزی تو بڑی بات ہے۔ روٹی چٹنی۔ یا پھر بھونی مرچ اور بھات۔ کچھ نہیں تو ذرا سا کڑوا تیل اور نمک اور بھر پیٹ بھات۔ اگلی بار مشر جی آئیں کے تو وہ کہہ دیگا کہ ہاں چلنا ہے۔

ڈھنیا نے چلنے کی حامی بھری تو مشر جی نے اسے ٹائر سے بنے موٹے چپل دیئے۔ کئی میل پیدل چلنا تھا۔ بیہڑ رستہ۔ کہیں کانٹا کنکر چُبھ گیا یا پھر چھالے پڑ گئے تو رستے میں ہی ڈھے جائے گا۔ ایک جھنڈا بھی تھمایا۔ جھنڈا ڈھنیا نے پرے رکھ دیا اور چپل ہاتھ میں لے کر گھما گھما کر دیکھنے لگا۔ دیر تک ہاتھوں میں ہی پہنے رہا۔ وہ مقدس شئے تو سر پر رکھنے کے لائق تھی جو اسے یوں آسانی سے حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے پیروں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ چپلوں کے عادی نہیں تھے۔ گٹے پڑے سیاہ پیر تالاب کی خشک اور سیاہ مٹی کی طرح پپڑائے ہوئے، بوائیاں پھٹے۔ یہ شاید ان انعامات کی بوچھار کا پہلا سلسلہ تھا جو اسے مشر جی کے ساتھ جلوس میں چلنے پر حاصل ہونے والے تھے۔ شہر کے خوف پر چپل غالب آ گئے۔ تیس سالہ ڈھنیا بچوں کی طرح ناچتا، سر پر چپل رکھے دوڑا چلا گیا۔ اپنی عورت اور بچوں کو دکھانے۔

اے جھنڈا تو اُٹھا۔ مشر جی پیچھے سے چلائے۔

وہ سب بہت سارے تھے۔ بل سے نکالے گئے چوہوں کی طرح۔ اچھا خاصہ آدھا میل لمبا جلوس تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے۔ پیٹ میں شربت پڑ چکا تھا اور بہت دیر تک ''جندہ باد'' ''جندہ باد'' کی مشق بھی۔ کوئی بیس پچیس آدمیوں کے بعد مشر جی کی طرح کا ایک ایک کارکن تھا جو ''انقلاب'' کا نعرہ بلند کرتا تھا۔ پتہ نہیں ''انقلاب'' کا کیا مطلب تھا۔ پوری

سبزی، شربت یا محض موٹا سا ایک چوہا۔

بھوک ڈھینا کے پیٹ میں ٹھوکریں مار رہی تھی۔ پتہ نہیں کھانا کب ملے گا۔ وہ کبھی چُپ ہو جاتا تھا، کبھی 'انقلاب' سُنے بغیر ہی جندہ باد، جندہ باد کرنے لگتا۔ اس کی آواز بھی پنچم سے مدھم پر اُتر آئی تھی بغیر کسی بندش کے زمین پر پھرنے والے پیر ٹائر کے چپلوں میں بوجھل ہوا اٹھے تھے۔ اس کی خواہش ہوئی کہ وہ چپل اُتار کر ہاتھ میں لے لے۔ لیکن کولتار کی سڑک تپ رہی تھی۔ گاؤں کی پگڈنڈیوں کی مٹی ایسی نہیں تپتی تھی۔ نہ ہی کبھی گاؤں میں اس نے اتنی گرمی اور اُمس جھیلی تھی۔ انتہائی بیزاری کے ساتھ وہ سڑ پٹر کرتا چل رہا تھا۔ بار بار اپنی قطار سے الگ بھی ہوا جاتا تھا۔ اچانک جلوس کے اگلے سرے پر کچھ تیز تیز آوازیں آنی شروع ہوئیں اور کچھ ہل چل مچی۔ ڈھنیا نے گردن نکال نکال کر آگے کی طرف کا حال جاننا چاہا۔ کچھ سپاہی ڈنڈے تان کر جلوس کو آگے جانے سے روک رہے تھے۔ سڑک پر ایک رسی بھی تنی ہوئی تھی۔ مارے خوف کے وہ اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ سپاہیوں کے نام سے اس کی رُوح فنا ہوتی تھی۔ وہ اسے یم راج کے کارندے لگتے تھے لوگوں کو پکڑ لے جانے والے غیر مرئی، غیر حقیقی۔ ان کے چاروں طرف لامتناہی طاقتوں کا ہالہ تھا۔ ان کی صُورت تباہی کی علامت تھی۔

بپّارے — اسے معلوم ہوتا تو کبھی نہ آتا۔ تسلّی کے لیے اس نے اغل بغل نظریں دوڑائیں لیکن ان چہروں کو وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کے جوار سے بیس پچیس لوگ آئے تھے لیکن ساتھ ساتھ نہیں چل رہے تھے۔ آگے پیچھے نہ جانے کدھر ہو گئے تھے۔ آگے ہنگامہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ جہاں پولیس والے لوگوں کو روک رہے تھے وہاں ایک ترا ہا تھا۔ دوسری طرف کی سڑک سے بھی ایک جلوس آ کر شامل ہو گیا تھا۔ نعرے تیز ہونے لگے تھے اور لوگ رُک گئے تھے۔ ڈھینا ہونقوں کی طرح سر کھُجاتا دوسروں کا مونہہ تاک رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس سے زیادہ تجربہ کار تھے۔ اکثر ڈھوڈھو کر اس طرح کے جلوسوں کے لیے لائے جا چکے تھے۔ جیبوں میں بھر بھر کر "پرچی" گرانے کے لیے بھی لے جائے گئے تھے۔ مٹی ڈھونے والے گدھوں کی طرح وہ نیتاؤں کو ڈھویا کرتے تھے۔ مگر ڈھینا تو خود مٹی کا ڈھیر تھا، جنگل کا مکوڑا، بل سے نکلا ہوا چوہا۔

اڑے رہیے گا۔ نیتا لوگوں نے کارندوں کو پہلے ہی سمجھا رکھا تھا۔ لاٹھی چارج ہو کوئی بات نہیں۔ اس سے آگے کی نوبت ہم نہیں آنے دیں گے۔ گولی نہیں چلنے دیں گے۔ باقی یہ کہ لاٹھی چلے،

آنسو گولے چھوڑے جائیں تو اچھا ہی ہے۔ ورنہ اخبار میں خبر کیسے آئے گی، لوگوں کو پتہ کیا چلے گا۔
پولیس نے ہلکا لاٹھی چارج کیا۔ جلوس کی اگلی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ پانی سے اٹھی لہروں کی طرح یہ بھگدڑ پیچھے کی طرف پہنچی۔ ڈھنیا پہلے ہی بھوک، گرمی، پیاس اور سپاہیوں کی صورت سے بدحواس ہو رہا تھا۔ اُسے ان آٹھ روپیوں کا سوچ کر بھی تسلی نہیں ہو رہی تھی جو اسے جلوس کے بعد ملنے والے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بیوی کا چہرہ گھوم رہا تھا اور دونوں چھوٹے لڑکوں کا بھی۔ بوڑھی ماں کی ننگی لٹکتی ہوئی سوکھی چھاتیاں اور باپ کا جھریوں سے اٹا سیاہ موہنہ۔ کانٹوں بھرے ببول کے درخت اور چٹختی ہوئی پیاسی دھرتی۔ دھول اڑاتی ہوا کے بگولے، ٹیلے پر چرتی بکریاں، گیہوں کٹنے کے بعد ٹنڈ منڈ کھیتوں میں گری پڑی سنہری بالیاں۔ اس کی بیوی اور لڑکوں نے مل کر جو سلا بینا تھا اس سے سیر ڈیڑھ سیر گیہوں ضرور نکل آئے گا۔ گھر میں آٹا پسے گا۔ آٹا پسے گا تو روٹی پکے گی۔ وہ اس وقت اپنی پتھر جیسے چہرے والی بیوی کے آنچل میں چھپ جانا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ وہ یہاں سے بھاگ نکلے اور سیدھا دوڑ کر اسی مانوس فضا میں پہنچ جائے جہاں اس کا کچھ نہیں تھا، پھر بھی سب کچھ اپنا تھا۔ اسی وقت ایک ریلا اور آیا۔ ڈھنیا بگٹٹ بھاگا۔ اس کی عقل پر تالے پڑ گئے تھے۔ اسے یہ بھی احساس نہیں رہا کہ ناک کی سیدھ میں یوں بھاگ نکلنے پر وہ لوگوں سے بچھڑ گیا تو مشر جی کی مدد کے بغیر گاؤں کیسے واپس جا سکے گا۔ جیب میں دھیلا ہے نہ کھوپڑی میں عقل۔ شتر بے مہار جیسا ڈھینا بمشکل تمام سو گز دوڑا ہو گا کہ مخالف سمت سے آتی ایک پولس جیپ کے نیچے آ گیا۔

جلوس ذرا سی دیر میں پھر سنبھل گیا تھا۔ بھگدڑ کوئی ایسی بڑی نہیں تھی۔ ایک آدمی سڑک پر مارا گیا ہے یہ خبر لوگوں کو بہت بعد میں ملی۔ وہ جلوس میں آیا ہوا کوئی آدمی تھا یا کوئی راہ گیر یہ بھی صاف نہیں ہو سکا تھا۔ مشر جی جن لوگوں کو ست پیڑوا گاؤں کی موسہر ٹولی سے لے کر آئے تھے ان کو انہوں نے اپنے ایک چیلے کے سپرد کر دیا تھا کہ واپسی کا انتظام دیکھ لے گا۔ ایک آدمی گنتی میں کم تھا یا مشر جی نے آٹھ روپے زیادہ دیے تھے اس کی تصدیق کی ضرورت اس نے نہیں سمجھی فاضل روپئے اس نے جیب میں ڈال لیے اور لوگوں کو بس میں چڑھوا دیا۔ ڈھنیا کے دو ایک جواریوں نے اس کا نام لیا تو لوگوں نے کہا کہ بہت بسیں جا رہی ہیں کسی میں بھی چڑھ لے گا۔

ڈھینا تین دن سرکاری مُردہ گھر میں پڑا رہا۔ جب لاش کی شناخت نہیں ہو سکی تو اس

کے کریا کرم کے لئے سرکاری فنڈ سے ساٹھ روپے ریلیز کئے گئے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد مارکین کے مہر لگے، بڑے سے تھیلے میں بھرا ہوا ڈھینا سرجو ڈوم کے حوالے کر دیا گیا۔

سالے۔ اپنی اماں کو پھو نکتے ہوں گے ساٹھ روپے میں۔ لکڑی کا بھاؤ معلوم نہیں ہے کیا۔ سب معلوم ہے پر سمجھتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ہُن برستا ہے۔ سو اس میں سے ہم لاوارث لاشوں کے کریا کرم پر خرچ کریں گے۔ بھنبھناتا ہوا سرجو لاش ٹھیلے پر لاد کر رات کے اندھیرے میں گومتی کے پُل پر لے گیا۔ بے دردی کے ساتھ پہلے اس نے ڈھنیا کو زمین پر پٹخا پھر مارکین کا تھیلا کھینچ کر الگ گیا۔ کوئی ڈھائی میٹر کپڑا تھا۔ عرض خاصہ چوڑا تھا۔ سلائی کھول کر مزے کی چادر نکل آتی ہے۔ دھوتی بناؤ چاہے چدّر اوڑھو۔ پہلے دس روپے میں بکتی تھی۔ اب پندرہ مل جاتے ہیں۔ چلو مہاراج گومتی میا کی گودی میں جاؤ۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں۔ جوان آدمی۔ یہاں کہاں آن مرے تھے۔ ان الوداعی الفاظ کے ساتھ سرجو نے ڈھنیا کو کھڑا کیا اور پُل سے نیچے پھینک دیا۔

سرجو ڈوم اب ہو چلا تھا بوڑھا۔ اس پر ٹھیلہ گھسیٹنے کی محنت۔ پورا دھکا نہیں لگا سکا۔ نہ ہی پھینکنے کا زاویہ صحیح تھا۔ لاش چکر کھاتی ہوئی سیدھی نیچے جانے کی بجائے پُل کے گرڈرز میں الجھ گئی۔ ساٹھ روپے اور چدّر، لے کر سرجو تاڑی خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن صبح پُل سے گذرتے دُودھ والوں نے سب سے پہلے مونہہ اندھیرے پُل کے پایوں سے الجھی لاش دیکھی پھر کچھ سویرے اٹھ کر ٹہلنے والوں نے، پھر کچھ اور لوگوں نے۔ پھر کچھ لوگ وہیں کھڑے ہو گئے۔

روز مرڈر، آئے دن قتل، یہ ہمارا سماج کدھر جا رہا ہے۔ کسی نے کہا۔

اجی آپ ایک لاش دیکھ کر پریشان ہیں۔ پنجاب ہو آیئے۔ دوسرے صاحب نے کہا پڑوس میں بہار کیوں نہ ہو آئیں۔ پنجاب تو دُور ہے۔ ایک تیسری آواز اُبھری آپ کا یو۔ پی بڑا دودھ کا دھویا ہے۔ بہُوت شانتی ہے یہاں۔ ایک شخص نے ان صاحب کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا جنہوں نے بہار کا نام لیا تھا۔ وہ صاحب سٹک لیے۔ یہ بہاری ہر جگہ بھر گئے ہیں۔ اب دو چار لوگ ہی تھے۔ ان میں سے بھی ایک بہاری نکل آیا۔

پولیس کسٹڈی میں مرا ہو گا بے چارہ۔ ایک صاحب بولے جو بس ابھی آ ہی رہے تھے۔ ساتھ ساتھ دو اخباری رپورٹر بھی سونگھتے سونگھتے پہنچ گئے تھے۔

ایک نے نوٹ بک نکالی۔ دوسرا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اُلّو کے اُلّو رہو گے۔ واقعے کی نیوز ویلو دیکھا کرو۔ اسے کسی ورنا کیولر چھتڑے کے لئے چھوڑ دو۔ ہیڈ لائن لگائے گا۔ دن دہاڑے سنسنی خیز قتل۔ پنجاب میں ایک دن میں دہشت گردوں نے تیس تیس چالیس آدمی مارے۔ یہ خبر نیشنل اسٹیٹس کے اخباروں میں ایک ننھے سے کونے میں چھپتی رہی۔ اب تو جب تک ہزار پانچ سو نہ مریں کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

دو چار حضرات میں فرض کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا۔ جاتے جاتے وہ کوئی دو سو گز کی دوری پر کھڑے کانسٹیبل کو اطلاع دیتے گئے۔ ڈنڈا پھٹکارتا ہوا کانسٹیبل وہاں پہنچا۔ اس نے بہت قریب سے لاش کا معائنہ کیا۔

دھت تیری کے۔ ارے بتیا نہیں۔ سرکاری 'ڈسپوجل' ہے۔ یہ دیکھ لیجئے۔ دیکھئے۔ اس نے دو سفید پوش لوگوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ لفنگے لگنے والے لونڈوں کو ڈنڈے سے دھمکایا کہ وہ ذرا دور ہی رہیں۔ پھر اس نے ڈنڈے کی مدد سے ڈھنیا کو الٹ دیا۔ لاش اب خراب ہو چلی تھی۔ سینے سے لے کر پیٹ تک پوسٹ مارٹم کا لمبا نشان تھا۔ موٹے سوت سے بے ڈھنگے اور بڑے ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ گلے میں تعویذ کی طرح ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس میں کچھ تفصیلات درج تھیں۔

لوگ دُور ہٹ گئے۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ اُلٹے ہوئے ڈھنیا کو کانسٹیبل نے ڈنڈے سے ٹھیلا۔ لاش جھپاک سے پانی میں گری اور کچھ لمحوں بعد اوپر اُبھر کر تیرنے لگی۔ ندی کنارے لگے پیڑوں پر بیٹھے گدھوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور پر پھڑپھڑائے۔ بڑبڑاتے ہوئے کانسٹبل نے زور سے تھوکا اور آستین سے مونہہ صاف کیا۔ سیرے سیرے گندھاتی لباس۔

پس نوشت: دُور اللہ میاں کے پچھواڑے بسے ایک دُور افتادہ گاؤں میں چند لوگ اپنے ایک پیارے کا انتظار کر رہے تھے جو آٹھ روپئے لانے گیا تھا اور شاید کچھ بچی ہوئی پوریاں بھی۔ اور ہندوستان جنت نشان کے کچھ لوگ دوسروں کی عبادت گاہیں ڈھانے اور گلے کاٹنے کے بعد رام راجیہ لانے کے پھیر میں خاصے مصروف تھے۔

☆☆

بھیڑیے

گودام سے بھینسوں کی سانی کے لیے سرسوں کی کھلی نکالتے وقت انجو رانی نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے اور امرائی میں کھڑے بور سے لدے آم کے درخت کسی تصویر کی طرح فریم میں جڑا اٹھے تھے۔ دُور کہیں کھیت مزدوروں کے چیتی گانے کی آواز آرہی تھی۔ ایسی صاف، دلکش اور واضح جیسے وہ سُرخ پھول جنہیں انجو رانی نے اپنے شوہر کی چچا زاد بہن کے جہیز میں دی جانے والی سفید چادر پر کاڑھ کر کل ہی مکمل کیا تھا۔ بوری بھر کر انجو نے کھڑکی کے پٹ بند کرنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ یکا یک امرائی کے درمیان سے گذرتی پگ ڈنڈی پر لمبے لمبے ڈگ بھرتی کرمّی نمودار ہوئی۔ اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز تھی اور چہرہ راکھ جیسا ہو رہا تھا۔

گھر کی دیواروں سے ایک بار پھر خون کی بُو آنے لگی تھی اور بارُود کی اور سازشوں کی۔ چاروں طرف سرگوشیوں کے ناگ سرسراتے پھرتے تھے۔ کوئی بھی آدمی اپنی عام آواز میں بات نہیں کر رہا تھا۔ کوئی بھی کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتا تھا۔ چاچا کے آگے پیچھے چلنے والے لٹھیت اور بندوق بردار پھر گھر میں در آئے تھے۔ انجو پر ایک شدید گھبراہٹ طاری رہنے لگی تھی۔

کرمّی گھر کے قریب آ گئی تھی۔ چوکنی آنکھوں سے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''میاں ٹولے میں بم پھوٹا ہے۔ پانچ ٹھو میاں لوگ مارے گئے'' اس نے پھولتی سانسیں سنبھالتے ہوئے مزید بتایا۔ ''جبار کی ماں نے سر پٹک پٹک کے ماتھا پھوڑ لیا''۔

''جبار کی ماں نے کیوں ماتھا پھوڑا؟ ارے رام رام رام۔ جبار مارا گیا کیا؟ وہ بدھوا کا اکیلا بیٹا؟''

''ہاں ۔ بھاگ کی بات ۔ جہاں بم پھوٹا وہاں وہ بھی کھڑا ہوا تھا ——— چٹھی دینی ہے کیا؟''

''نہیں ابھی نہیں ۔ پرسوں آنا۔ لکھ کر رکھوں گی۔'' انجو نے اِدھر اُدھر دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

''برج کشور بابو گھر نہیں آئے ۔ یہ مہینہ بھی خالی گیا۔''

کرملی کا جُملہ پورا ہونے سے پہلے چاچی کی کرخت آواز کھلے آنگن میں یوں پھیلی چلی آئی جیسے تالاب میں پھینکے گئے پتھر سے اٹھتے پھیلتے پانی کے دائرے۔ ''بہو۔اُو۔اُو''

کرملی تیر کی طرح وہاں سے بھاگی اور انجو کسی روبوٹ کی طرح۔

انجو رانی کو چھوڑ کر باقی چودھری خاندان کے ہر فرد کی صورت دیکھ کر بلکہ آواز سُن کر ہی کرملی کی جان نکلتی تھی۔ کرملی گاؤں کی نہیں تھی۔ وہ ایک آٹھواں درجہ پاس، خانماں برباد آدی باسی عورت تھی جسے تعلیم بالغان والے اپنا سنٹر کھول کر اس دُور افتادہ اندھیرے گاؤں میں چھوڑ گئے تھے۔ اس کی پھونس کی جھونپڑی میں ایک پوٹلی میں اس کے دو جوڑ کپڑے تھے اور مٹی کے چند برتنوں میں آٹا دال، چاول۔ یہی اس کی کُل کائنات تھی۔ سر پٹر سارے گاؤں میں گھومتی لوگوں کو سنٹر آنے کی ترغیب دیتی پھرتی تھی۔ مہینے دو مہینے میں ایک مرتبہ بلاک آفس جا کر پروجیکٹ افسر کو سینٹر کی رپورٹ دے آتی تھی۔ تب ہی انجو رانی کا چُپکے سے پکڑایا ہوا خط جو اس کے شوہر کے نام ہُوا کرتا تھا، پوسٹ کر آتی تھی۔ ہر خط میں ایک ہی بات ہوتی تھی۔ 'ہمیں شہر کب بُلاؤ گے۔ یہاں ہمیں ڈر لگتا ہے' برج کشور کبھی خط کا جواب نہیں دیتا تھا۔ مہینے دو مہینے میں خود ہی چلا آتا۔ دو چار روز رہتا اور محبت کے بے پناہ اظہار کے ساتھ تسلی دے جاتا کہ اگلی مرتبہ...... بس اگلی مرتبہ وہ چاچا سے یہ کہنے کی ہمت ضرور کرے گا کہ وہ انجو کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔ لیکن اس بار تو چھ ماہ کی غیر معمولی طویل مدت گذر گئی تھی اور وہ گاؤں آیا ہی نہیں تھا۔ انجو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بپھری ہوئی ندی کی اندھیری گہرائیوں میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور پانی ہے کہ چٹان کی صورت اس کی چھاتی پر چڑھا چلا آ رہا ہے۔

چاچی کی آواز کی بازگشت فضا میں تحلیل ہونے سے پہلے انجو رانی نے آنگن پار کرلیا تھا مرد آ گئے تھے۔ مرد یعنی چاچا، ان کا بڑا بیٹا نند کشور اور چار گھنی، چڑھی ہوئی مونچھوں والے لٹھیت جن کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔ انجو نے آٹے کی پرات سرکائی، ارہر کے راٹھے جوڑ کر آگ تیز کی اور مشین کی سی تیزی سے روٹیاں ڈالنی شروع کیں۔ گھر کے کھیتوں میں اُگے سنہری گیہوں کی گرم گرم روٹیاں۔ گدبدی، گداز، لذت اور توانائی سے بھرپور روٹیاں۔ نند کشور سوچ رہا تھا کہ انہیں پکانے والی بھی شاید ان روٹیوں جیسی ہی تھی۔ اس کی اپنی دھان پان، چمرخ سی بیوی 'حسبِ دستور قدیم' زچگی کے لئے میکے بھاگی ہوئی تھی۔ پرنچی مریل مرغی۔ چھوؤ تو ہڈیاں گڑتی تھیں۔

گٹھیا کے مارے گھٹنے اور تھلتھلا جسم سنبھالتی، کانکھتی کراہتی چاچی وہیں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''سنا کہ جبار مارا گیا نند کشور کے بابو۔؟'' انہوں نے پھولتی سانسوں کے درمیان دریافت کیا۔

''ہم جبار کا بُرا نہیں چاہتے تھے۔ سسرا نہ جانے کہاں سے وہاں پہنچ گیا تھا۔'' چاچا نے بے پروائی سے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ ''بُرا تو ہم میاں ٹولے کے کسی آدمی کا نہیں چاہ رہے تھے لیکن ستیارتھی جی کے بل پر کچھ زیادہ ہی کودنے لگے تھے وہ لوگ۔ کھانے کو ہے نہیں چلے راج نیتی کرنے۔''

''راج پاٹ سے ستیارتھی جی جیتیں گے ہمارے جیتے جی؟ میاں تو میاں آدی واسی، ہریجن سب کو ورغلا رکھا ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہو گیا ہے۔ کہتا ہے مندر بننا ضروری نہیں ہے۔ ہم کو روٹی چاہئے پوچھو سالے روٹی کیا مر کے کھاؤ گے؟ کھاؤ گے تو تب ہی جب زندہ رہو گے۔'' نند کشور کی آواز غصے کی شدت سے کالے ناگ کی پھنکار جیسی ہو گئی تھی۔ آواز تو آواز اس کا تو چہرہ بھی کالے ناگ کے پھن جیسا ہی لگنے لگا تھا۔

عرصہ ہوا کہ چاچی نے جوان بیٹے کے مونہہ لگنا بند کر دیا تھا۔ اس لئے وہ شوہر سے مخاطب ہوئیں۔ ''ہریجن کا پورا بوتھ تو پچھلے چناؤ میں بھی تم ہی نے چھاپا تھا نند کشور کے بابو۔ بے کار خون خرابے میں کاہے کو پڑتے ہو۔ بہت ہُوا پچھلی بار بھی۔''

پانچ سات آدمیوں کی کوئی ہستی ہے۔ یہ تو نمونہ تھا۔ پولنگ کے دن گھر سے ایک آدمی

بھی باہر نکلا تو ٹولے کا ٹولہ صاف کرادیں گے۔'' نند کشور کی غراہٹ اس بار کسی بھیڑیے سے مشابہہ تھی۔

''موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔کل تک تو نادر میاں کی جورُو بھی بھاڑ میں بھنتے چنوں کی طرح پھڑ پھڑ کر رہی تھی۔ چمک کر بولی تھی' کیسے نہیں جائیں گے پرچی گرانے؟ دیکھیں گے کون روکتا ہے' آج مزاج ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔'' ایک لٹھیت نے کہا۔

''اُٹھالائیں کیا؟ اور ٹھنڈا ہو جائے گا؟'' دوسرا شخص ہنس کر بھرے مونہہ سے بولا۔

نند کشور کی تھالی میں گرم روٹی ڈالتی انجو نے جھرجھری لی۔اب کیا عورتیں بھی اٹھائی جائیں گی۔اس کا ذہن ابھی جبار کی موت کے دھچکے سے اوپر نہیں اٹھ سکا تھا۔جبار تو فصل پر اپنے ہی کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا۔بڑا ہنس مکھ کڑیل جوان تھا۔دھان کے کھیتوں میں روپنی کے وقت پھٹا بنیان پہنے دن دن بھر پانی میں کھڑا رہتا۔سب سے زیادہ کام کرتا اور دوسرے مزدوروں پر بھی نظر رکھتا۔وہ رہتا تھا تو انجو کو اپنی ذمہ اری ہلکی ہوتی محسوس ہوتی تھی۔پانچ لوگ جو اور مارے گئے وہ بھی تو اپنے اپنے گھر والوں کے پیارے ہوں گے۔مرنا کون چاہتا ہے۔لنگڑا،لولا، بیمار، بوڑھا بھی نہیں چاہتا کہ اس کے سر پر بم پھوٹے اور وہ مر جائے۔انجو کو محسوس ہوا آج وہ کھانا نہیں کھا سکے گی۔اس کا کلیجہ مونہہ کو آرہا تھا۔

''پولیس تو ابھی نہ آئی ہوگی؟'' ایک شخص نے پوچھا

''پولیس سسری کل دوپہر تک بھی آجائے تو جلدی جانو۔''

''آنے دو سالوں کو۔ ہمارا کیا لے جائیں گے۔ چاچا نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔

چاچا کبھی کسی سے نہیں ڈرا تھا۔اس کے پاس طاقت تھی۔روپے کی اور لٹھیتوں کی اور اونچی ذات کی اور بہت تیز چلنے والے، جوڑ توڑ لگانے والے دماغ کی جو اس کے بیٹے کے قبضے میں تھا۔یہ اور ان کی بادشاہ گر جماعت مظلوم، کمزور، غریب لوگوں سے بھرے اس گاؤں میں جب چاہے آفت برپا کر سکتی تھی، کسی بھی دل کو دہشت سے بھر سکتی تھی، کسی بھی جسم کو پارہ پارہ کر سکتی تھی۔

زندگی کی ایک طویل جدو جہد سے گذرتی کرمّی اب ایسے مقام پر پہنچی ہوئی تھی جہاں اسے کوئی ڈر نہیں ہونا چاہئے تھا۔عورت کو خوف ہوتا ہے اپنے جسم کا۔وہ راکھ ہو چکا تھا۔پھر ڈر ہوتا ہے شوہر اور بچوں کا۔وہ سب اسے چھوڑ کر تتر بتر ہو چکے تھے۔اس کے بعد ڈر ہوتا ہے مال اسباب

کا۔ یہ جنس اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ لیکن اس ائے باوجود دوبارہ اس کی زندگی میں پنجے گاڑنے لگا تھا۔ راہ چلتے کبھی چاچا کا سامنا ہو جاتا کبھی نند کشور کا۔ کبھی ان کے حواریوں مواریوں میں سے کسی کا۔ وہ سب اسے خوفناک نظروں سے گھورتے۔ اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود موسہر ٹولے اور میاں ٹولے کے لڑکے بالے اور عورتیں سنٹر آنے کو تیار نہ ہوتے۔ بڑی منت سماجت اور پکڑ دھکڑ کے بعد جو دو چار ہاتھ آتے وہ ہفتہ دس دن میں بھاگ کھڑے ہوتے۔ پروجیکٹ افسر کو جو رپورٹ وہ دے کر آتی اس میں نئی بھرتی کے مقابلے میں ''ڈراپ آؤٹ'' کا کالم کہیں زیادہ بھرا ہوا ہوتا تھا۔

چاچا اور نند کشور کے اندر کتنی بارود بھری ہوئی ہے یہ کرملیؔ کو نہیں معلوم تھا۔ شروع شروع میں گاؤں آئی تو گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے سب سے پہلے اسی ڈیوڑھی پر آئی تھی۔ انجو رانی کی میٹھی زبان اور ملنسار طبیعت نے اسے گرویدہ بنالیا تھا۔ اسی نے انجو سے کہا تھا کہ اگر وہ اس کے ساتھ بستی میں چل کر لوگوں کو سمجھائے تو لوگ سنٹر پر آنے لگیں گے۔ اُنجو نے دبی زبان سے گھونگھٹ کی اوٹ سے چاچا سے اجازت چاہی تھی۔

عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ چاچا غرایا تھا۔ ہمارے یہاں کی بہُو بیٹیاں چپل سٹکاتی، مردوں سے دیدے لڑاتی کرملیؔ کی طرح جہاں تہاں گھومتی نہیں پھرتیں۔

''کرملیؔ تو بہت نیک عورت ہے چاچا۔ پھر یہ کہ وہ بزرگ ہے۔ وہ تو سرکار کی طرف سے کھولے گئے......'' بہُو کا لحاظ کئے بغیر چاچا نے سرکار کو موٹی سی گالی دی تھی۔'' کیا کرے گی سرکار ان کو پڑھا کے نوکری دے گی؟ کس کس کو دے گی؟''

''چاچا، پڑھنا لکھنا صرف نوکری کے لئے تو نہیں ہوتا۔'' انجو رانی اس دن بڑی ہمت بٹور کر آئی تھی۔

''پھر کا ہے کے لئے ہوتا ہے۔ ذرا ہم بھی سنیں۔''

''کہتی تھی گاؤں میں گندگی بہت ہے۔ پڑھ لکھ کر لوگ صفائی سیکھیں گے۔ دھوکا دھڑی سے بچیں گے۔ اپنا بھلا برا سوچ سکیں گے۔''

چاچا اس بار پوری طرح ہتھے سے اکھڑ گیا۔ آنگن میں گھوم گھوم کر اس نے تعلیم بالغان کی مہم، سرکار، کرملیؔ اور سارے سرکاری عہدیداروں کو بے نقط سنانی شروع کیں۔ لانبے گھونگھٹ

کے باوجود انجو شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ 'کرملی گھر کی بہو کو ورغلا رہی ہے، کہہ کر ان لوگوں نے گاؤں میں اس کا رہنا دوبھر کرنے کی مہم تیز کردی تھی۔

نندکشور نے ایک دن کرملی کو مُکھیا کے کھیتوں کی منڈیر پر پکڑا۔ '' کیوں ری بڑھی۔ گاؤں چھوڑ کے جاتی ہے یا زندہ جلوادوں تجھے۔''

ایک لمبے تڑنگے لٹھیت نے اس کی کمر میں لاٹھی چبھوئی۔ '' کہو تو نندکشور بابو گردن داب کے کھیتوں میں توپ دیا جائے۔ پورے گاؤں میں کوئی مائی کالال پوچھنے کی ہمت نہیں کرے گا کہ بڑھی کہاں گئی۔''

''ہاہاہا...... اس کے جسم کی کھاد بنی تو فصل لہلہا اٹھے گی۔''

کرملی تھرتھر کانپنے لگی۔ '' بابو لوگ ہمارا قصور تو بتائیں۔ دو اچھر پڑھا دینا تو پُن کا کام ہے۔''

'' ارے بڑھی۔ پُن کمانا ہے تو رام کا نام جپ۔ زیادہ پُن کمانا چاہتی ہے تو چلی جا کرسیوا کے لیے اجودھیا۔ موسہر چماروں کو ورغلا کے ہی پُن کمائے گی کیا؟''

کرملی گھگھیانے لگی۔ ہم راج نیتی کیا جانیں بابو۔ ہم تو سیوا بھاؤ سے پڑھانے آئے ہیں۔

اری او پنڈتانی۔ ہمارے کھیت مجور توڑ رہی ہے۔ موسہر چمار پڑھیں گے تو کھیت مجوری کون کرے گا۔ تیرا باپ کہ ہم؟ ویسے بھی نیچ، کمین سب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے ہیں۔ اوپر سے انہیں پڑھایا بھی جائے گا؟''

'' اور میاں لوگوں کو بھی؟ اور جنانیوں کو بھی؟ یہ تو حد ہے۔''

'' برج کی عورت کی چٹھی لے جا لے جا کے ڈالتی ہے۔ کس کے نام لکھتی ہے وہ، سو تو یہی جانے۔ اب گاؤں کی کنواریوں کو بھی لکھنا سکھائے گی۔ پھر خود ہی لے جا کے ان کے یاروں کو چٹھیاں پہنچائے گی۔''

'' رام کا نام لو بابو۔ اپنی بہو پر بھی دوش لگا رہے ہو۔'' کرملی کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ دھپ سے وہیں گیلی مٹی پر بیٹھ گئی۔

'' بحث کئے جائے گی۔ چُپ نہیں ہوگی۔'' ایک نے اس کے رُوکھے کھچڑی بالوں کی پتلی سی چُٹیا کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔

تب سے کرملی ان کے سائے سے بھی بچ کر چلتی تھی۔ جو دو چار لوگ خود سے سینٹر پر

آ جائیں ان کو الٹے سیدھے دوحرف سکھا کر اپنی ڈیوٹی پوری کرلیا کرتی تھی۔ مگر سارے خوف کے باوجود چوری چھپے پچھواڑے والے دروازے سے ہفتہ دس دن میں انجو رانی سے ضرور مل لیا کرتی تھی۔ انجو نوجوان تھی، خوبصورت تھی، اعلیٰ ذات تھی اور کھاتے پیتے زمین جائداد والے گھرانے کی بہو۔ بظاہر کچھ بھی تو مشترک نہیں تھا اس کے اور کرملّی کے بیچ لیکن کرملّی کو معلوم تھا انجو اس جیسی ہی تھی۔ اکیلی اور خوف زدہ۔ اور دل گرفتہ۔

انجو، برج کشور کی بیوی تھی جو چاچا کے مرحوم چھوٹے بھائی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ گونگا اور بہرا۔ اس کی دو بہنیں تھیں۔ چاچا نے دونوں کا بیاہ کرا دیا تھا۔ برج کشور کو گونگوں بہروں کے اسکول میں داخلہ دلوا کر پڑھایا تھا۔ علاقے کے ایم۔ ایل اے کی سفارش پر اسے سرکاری نوکری سے بھی لگوا دیا تھا۔ رہنے کو چھوٹا موٹا کوارٹر بھی ملا ہوا تھا۔ برج کشور کی ماں کا رُواں رُواں جیٹھ کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ ان کی مجال نہیں تھی کہ وہ جائداد کے بٹوارے کی بات کریں۔ وہ تو اپنی ہر بات کا آغاز اس جُملے سے کرتی تھیں'' بھائی جی نہ ہوتے تو......'' برج کشور کو نوکری ملنے کے بعد وہ ویسے بھی گھر سے الگ تھلگ اس کے ساتھ شہر جا کر رہنے لگی تھیں۔ جیٹھ اور ان کے لڑکے کے سیاست میں قدم رکھنے کے بعد گھر میں جو فضا بنی تھی وہ انہیں پسند نہیں تھی۔ پھر برج ان کا اکلوتا بیٹا تھا جو جسمانی معذری کا شکار بھی تھا۔ شہر میں انھوں نے اس کے لئے پہلے ایک لڑکی پسند کی تھی جو خود بھی گونگی بہری تھی۔ وہ بھائی جی سے اجازت لینے اور چل کر بات پکی کر دینے کے لئے کہنے کو آئیں تو بھائی جی بانس بانس بھر اچھلنے لگے۔

گونگی بہری؟ برج کشور کے لئے؟

'برج کشور کے لیے نہیں تو کیا کسی درست آدمی کے لئے؟ کون دے گا برج کو لڑکی؟

انہوں نے دل میں سوچا پھر ہمت کر کے بولیں'' برج کی دیکھی بھالی ہے۔ اسے پسند ہے۔''

ہوا کرے۔ چاچا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ہم اپنے بھتیجے کے لئے بولتی سنتی لڑکی لائیں گے۔'' برج کو پسند ہے۔ مونہہ۔'' وہ موہنہ ٹیڑھا کر کے چڑانے والے انداز میں بولا تھا۔

'' بولتی سنتی ہوگی تو لنگڑی لُولی ہوگی۔ ورنہ بہت ہی بدصورت ہوگی۔ گورا چِٹا، لانبے قد کا خوبصورت جوان بیٹا۔ برج کشور کی ماں ایسی کسی بہو کے تصور سے اداس ہو گئیں۔

'' جنانی کی عقل پاؤں میں ہوتی ہے۔'' چاچا زور سے بولتا ہوا اٹھ گیا۔'' ارے ہم

لائیں گے ڈنکے کی چوٹ۔ گاؤں کی صحت مند، سگھڑ بہو۔ دو چار درجہ پڑھی بھی ہے۔ بی۔اے۔، ایم۔اے کا ہمیں کیا کام۔ وہ بھی شہر کی لڑکی۔ ہمارا لڑکا گونگا ہے تو ہم لڑکی بھی گونگی لائیں۔ کون سے شاستر میں لکھا ہے؟''

چاچا دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ اس نے انجو رانی کا گھرانہ کافی عرصے سے تاک رکھا تھا۔ ان کی برادری میں اتنے غریب لوگ مشکل سے ملتے تھے۔ اوپر سے لڑکی ماما کے گھر رہ کر پلی تھی۔ ماں مر چکی تھی۔ باپ دوسری شادی کر کے بیوی بچوں میں مگن تھا۔ کبھی الٹ کر بھی پہلی بیوی کی اس اکلوتی اولاد کو نہیں پوچھا۔ چاچا نے تِلک جہیز کچھ نہیں مانگا۔ لوگ نہال ہو گئے۔ لڑکی گھر بار کی ہو گئی اور وہ بھی ایسے کھاتے پیتے بارسوخ گھرانے کی بہو بنی۔ غریب ماما کے گھر رہ کر پلی بن ماں کی بچی۔ خدمت گذار اور نیک۔ وہ ایسا پرزہ ثابت ہوئی جس کی کمی لمبی چوڑی گرہستی کی گاڑی میں بہت دن سے کھٹک رہی تھی۔ چوبیس گھنٹے چلنے والے سیاسی چولہے سے لے کر چاچی کی ساری بیماریاں، بھینسال کی بھینسوں سے لے کر ہالی اور ہل بیل، مزدوروں سے لے کر لٹھیت،، سب اس نے سنبھال لئے تھے۔ اس کا دن اٹھارہ گھنٹے کا ہوا کرتا تھا۔ وہ کب سونے گئی اور کب سو کر اٹھی، یہ کسی کو پتہ ہی نہ چلتا۔ ہمیشہ جاگتی اور کچھ نہ کچھ کرتی ہوئی ہی ملتی۔ برج کشور کی ماں آتیں تو بڑی دعائیں دیتیں اور پھر حسرت بھری نظریں بہو پر ڈال کر رخصت ہو جاتیں۔ یہ چھن چھن پائل بجاتی، محنتی، سگھڑ بہو کب ان کے بیٹے کا گھر آباد کرے گی۔ لیکن کس مونہہ سے مانگیں۔ کیسے مانگیں۔ برج کی تعلیم، نوکری، شادی سب چاچا کی مرہونِ منت تھی۔ بہو پر پہلا حق تو انہیں کا ہوا نا۔ پھر برج کشور آتا جاتا تو رہتا ہی تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ جاتیں۔

اس طرح چار برس گزر گئے۔ گھونگھٹ کے اندر خاموش آگ میں جلتی رہی انجو۔ اس کے یہاں کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی کہ اس کے بہانے جانے کے لیے کہتی۔ گھر کی اصل مالکن بھی نند کشور کی بہو تھی۔ جب چاہتی میکے جاتی۔ جو چاہتی کرتی۔ کئی بیٹے پیدا کئے تھے اس نے۔ انجو کا کیا تھا یہاں۔ جس گھر پر اس کا مکمل حق تھا وہاں تو بس ایک بار چند دن کے لئے پاؤں پڑے تھے اس کے۔

وہ رات انجو رانی کو بہت بھاری لگ رہی تھی۔ روز سارے دن بیل کی طرح کام کرنے کے بعد اُسے مردوں کو مات دینے والی نیند آیا کرتی تھی لیکن آج نیند آ۔آ کر واپس لوٹ رہی تھی۔ آتی بھی تھی تو اچٹتی ہوئی۔ اگلے دن پولنگ تھی اور گاؤں میں موت کا سناٹا چھایا ہوا

تھا۔کل نہ جانے کتنے لوگ اور مریں گے ۔شاید ان میں کسی اور بیوہ کا بیٹا ہوگا، کسی تو جوان سہاگن کا مرد ہوگا، کسی کنبے کا اکیلا پالن ہار ہوگا۔اور ان میں سے کسی کو کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں رہی ہوگی ۔جیسے کل مرنے والے جبّار کو نہیں تھی ۔اور پچھلے الیکشن میں جو مرے تھے بیس بچیس کڑیل جوان......

پھر نیند کی ابھرتی لہروں میں انجو کو ایسا لگا جیسے وہ چرخ چوں، چرخ چوں کرتی بیل گاڑی میں بیٹھی شہر کی طرف روانہ ہے۔گاڑی چلتی چلی جارہی ہے۔سُوکھی گیلی ندیاں پار کرتی، کھیت کھلیانوں سے گذرتی، میدان اور پہاڑ لانگتی ۔اچانک ایک ریگستان آتا ہے۔ جہاں ریت کے بگولے اڑ رہے ہیں اور ان بگولوں کے پیچھے سے نند کشور کا چہرہ برآمد ہوتا ہے۔

ہڑبڑا کر وہ اٹھ بیٹھی ۔نند کشور تو سچ مچ دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔اس نے جلدی سے گھٹنوں تک چڑھ آئی ساڑی برابر کی، سر پر آنچل لیا اور پلنگ سے اتر گئی۔ بھائی جی آپ؟ کیا بات ہے؟

''ہمارے چار آدمی بلاک آفس گئے تھے۔ابھی لوٹے ہیں۔روٹی دینی ہوگی۔''

''جی بھائی جی ابھی بناتی ہوں۔''اس نے چپلوں میں پیر ڈالے۔

برج نے دوسرا بیاہ کرلیا ہے۔''نند کشور نے یوں کہا جیسے کوئی پرسکون، اچھا بھلا، آدمی کھڑے کھڑے اچانک پتھر پھینک مارے۔

کیا......؟انجو کا ایک پیر جیسے ہوا میں معلق ہوگیا۔

''ہاں۔اس گونگی بہری لڑکی سے......پہلی پسند تھی نا۔''

انجو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔کون گونگی۔کس کی پسند۔ٹکر ٹکر جیٹھ کا مونہہ تاکتی رہی۔

''فکر کی کوئی بات نہیں ۔ہم ہیں نا۔اس نامرد کی پروا کیوں کرو تم؟ آج تک ایک چوہیا کا بچہ بھی نہ پیدا کراسکا۔ایک ہماری والی ہے۔سال میں نَو مہینے تو میکے بھاگی رہتی ہے۔اصل بہُو تو تم ہو۔سارا گھر تمہارے حوالے ہے۔تمہارا حق کہیں نہیں جائے گا۔''نند کشور کے تنومند جسم نے جیسے جھرجھری سی لی۔چلو اٹھو شاباش۔ پھٹا پھٹ روٹیاں ڈال دو۔کہتا ہوا وہ پیٹھ موڑ کر چلا گیا۔

تو اسی لیے ۔جوان جہاں شادی شدہ لڑکا، پھر بھی عورت سے دُور۔سامنے ایسی لڑکی موجود تھی جس کے لیے دل میں نرم گوشے موجود تھے۔گونگی بہری ہونے کی وجہ سے اس میں کسی قسم

کا احساسِ کمتری بھی بیدار نہیں کرتی تھی۔ بیاہ رچالیا ہو تو تعجب کیا ہے۔ انجو کے ذہن سے اسی وقت جبار، اور وہ سب جو پہلے مرے تھے یا کل مرنے والے تھے، محو ہو گئے۔

—— الیکشن منصوبہ بند دھاندلیوں کے ساتھ ہوا۔ ستیارتھی جی بُری طرح ہارے اور چاچا کی پارٹی جیت گئی۔ اگلی مرتبہ چاچا خود الیکشن میں کھڑا ہو گا۔ جشن کے اس ماحول میں ایک بم گائے جیسی بے زبان انجو نے پھوڑا۔ اپنی شکستہ تحریر میں اس نے شوہر کو لکھا کہ اب وہ یہاں ایک پل بھی اور نہیں رہے گی۔ وہ اس کی بیاہتا ہے اس لئے وہ سیدھے سبھاؤ آ کر اسے رخصت کرالے جائے ورنہ وہ پنچائیت بُلائے گی۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اس کے جیٹھ کی نیت میں کھوٹ معلوم ہوتا ہے اس لئے وہ اس طرح کا الٹی میٹم دینے کو مجبور ہے۔ وہ پلو میں اس خط کو چھپائے کرملّی کے یہاں گھر کے پچھواڑے سے تیز تیز قدم اُٹھاتی چلی جارہی تھی کہ نند کشور کی عقابی نظروں کی گرفت میں آ گئی اور خط پکڑا گیا۔

''پنچائیت کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا۔ بات ہمارے گھر کی ہے اس لیے پہلے فیصلہ ہم کریں گے۔'' چاچا آنگن میں گھوم گھوم کر دہاڑنے لگا۔

''بہو کو یوں گھر سے نہ نکالو۔'' چاچی نے منت کی۔ ''اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ پھر ویسا کون ملے گا جو سارا گھر سنبھال لے۔ نوکروں چاکروں کا بس چلے تو ہمیں کنگال بنا دیں۔ کھیت کھلیان تک سر پر اٹھا لے جائیں۔ کام کم۔ حرام خوری زیادہ۔ ہم سے تو اب کچھ ہوتا نہیں نند کشور کے بابو۔''

''جنانی کی عقل پاؤں میں۔ اسے نکال کون رہا ہے۔ بس ذرا مزا چکھانا ہے۔ جائے گی کہاں؟ اس کا بھکّو ماما تو دوسرے دن ہی یہاں لا کر ڈال جائے گا۔ اور برج کی ماں کی بھی مجال نہیں ہے کہ ہماری مرضی کے بغیر بہو کو لے جائے۔ دیکھتی جاؤ تماشہ۔'' پھر وہ انجو کی کوٹھری کی طرف مونہہ اُٹھا کر دہاڑا۔ اِس بڈّھے سسر نے تو برج کشور کو بس پیدا کیا تھا۔ پالا پوسا، پڑھایا لکھایا ہم نے، نوکری دلائی ہم نے۔ اس کچھنی کو بیاہ کے لائے ہم۔ اور یہ یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ دیوتا جیسے جیٹھ پر الزام لگاتی ہے۔ گھر کی عزت پنچائت میں نیلام کرنے کو کہتی ہے۔ جا نکل جا یہاں سے۔ ابھی چلی جا۔ بہو کا گذارا ہے اس گھر میں۔ رنڈی پتریا کا نہیں۔'' چاچا جھاگ اُگلنے لگا۔

کوٹھری میں کھڑی انجو رانی تھر تھر کانپا کی۔ چاچا اتنا ناراض تو کبھی کسی سے نہیں ہوا تھا۔

شاید میاں ٹولے میں بھی نہیں جہاں وہ اسی طرح چلایا تھا۔'' یہاں تم کو رہنے کا ادھیکار دیا ہم نے۔ مسجد بنانے دی ہم نے۔ ووٹ کا ادھیکار دیا ہم نے۔ زمین میں ہل چلانے دیا ہم نے۔ اب تم ووٹ دو گے ستیارتھی جی کو۔ یاد رکھو ہم جب چاہیں گے گیہوں کی فصل کی طرح تمہیں درانتی سے کاٹ کر پھینک دیں گے۔ مسجد کی ایک ایک اینٹ اُکھاڑ لے جائیں گے۔ جب ہم سرکار کی ناک کے نیچے سے اکھاڑ لے گئے تو تم یہاں کس گنتی میں ہو؟'' پورے میاں ٹولے کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ چھاتی ٹھونکتے چاچا کے گُرگے پگڈنڈیوں پر دُندمچاتے گذر گئے تھے۔

تازہ ہوا میں ذرا کی ذرا سانس لینے کو انجو کوٹھری سے باہر اوسارے میں اور اوسارے سے بھی باہر کُھلی زمین پر آ گئی۔

گیہوں کٹ چکا تھا۔ کھیتوں کی ننگی بھوکی زمین آنکھوں کے آگے سر سر کر رہی تھی۔ اوپر چاند پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ انجو کو ایسا لگا کہ وہ ننگی کھڑی ہے۔ چاندنی میں نہائی ہوئی۔ جسم پر ایک تار نہیں اور قریب کی امرائیوں میں بھوکے بھیڑیوں کا جھنڈ اس کا منتظر ہے۔ بھیڑیے جو طاقت ہیں۔ طاقت جو روپیہ ہے۔ طاقت جو ہتھیار ہے۔ طاقت جو ریگستانوں کے کنوؤں میں تیل بن کر بہتی ہے۔ طاقت جو سیاسی بازی گروں کی ٹیڑھی عقل ہے۔ طاقت جو پنچائت کے پنچوں کو خرید لینے کی صلاحیت ہے۔ طاقت جو مرد کی جنسی برتری ہے۔ طاقت جو قتل کو خودکشی اور نسل کُشی کو فساد کہلوانے کی قدرت ہے۔

انجو نے نظریں اٹھا کر چمکتے چاند کو دیکھا۔ خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھا۔ اے خدا کی قدرت کے مظہر کیا تم نے خدا کو دیکھا ہے؟ کیا خدا کہیں ہے؟ ملے تو پوچھوں کہ جنہیں تم طاقت سے نوازتے ہو ان کا ضمیر کیوں چھین لیتے ہو؟ ان کے دلوں سے درد کیوں ختم کر دیتے ہو؟

امرائی میں کوئی لکڑ بگھا زور سے ہنسا۔

انجو دیر تک کسی ٹنڈ منڈ پتے جھڑے خزاں رسیدہ درخت کی طرح اُگی کھڑی رہی۔ پھر سر جھکائے کوٹھری میں واپس آ گئی کہ کمزوروں کے لئے کال چکر سے باہر نکلنے کی تمام راہوں پر بھیڑیے پہرہ دیتے رہتے ہیں۔

☆☆

قشقہ

سن پچاس میں چھجو تھے تو کوئی ساٹھ برس کے لیکن لگتے ستر کے تھے۔ دُبلے ایسے کہ پھونک مارو تو اڑ جائیں۔ وقت کی مار نے گھس دیا تھا۔ بقول بڑے ماموں پچخ گال بُرے حوال۔ ویسی ہی خستہ حال ذرا سی دوکان بلکہ پھر بقول بڑے ماموں دُکنیا، بڑی ممانی کے جہیز میں جو آبنوس کی الماری آئی تھی وہ چھجو کی دوکان سے کچھ زیادہ لانبی چوڑی تھی، اور گہری بھی۔

ماموں کی اپنی اولادیں نہیں تھیں۔ بھانجی بھانجے ننہال یعنی ان کے گھر آتے تو وہ ان کے بڑے لاڈ کرتے۔ صبح صبح ہر بچے کو ایک لانبی سی گلوری نما تکونی پڑیا میں ملتے بادام، مصری اور ایک چونی۔ اس زمانے میں چونی سے خاصہ کچھ خریدا جا سکتا تھا۔ سڑک پر تھوک پڑا ہوتا تھا تو ملگجے اندھیرے میں اسے چونی سمجھ کر ایک بار تو لوگ باگ ضرور جھک جایا کرتے تھے اب واقعی چونی پڑی ہو تو تھوک سمجھ کر نظر انداز کر جائیں۔

سن پچاس میں ننہال آئی ننھی رضیہ کو بادا موں کی ایسی پُڑیا ملی جس میں سے چونی بھی نکلے تو وہ تالیاں بجا کر کودنے لگی۔ رنگین پنسل، الایچی دانے، کھٹی میٹھی گولیاں خرید لانے کے باوجود شاید ایک اوھنا بچ ہی جائے گا۔ اور اس سارے سامان کے لیے چھجو زندہ باد۔

اے چھبو، ایک پیسے کے الایچی دانے
اے چھجو، ادھنے کی روشنائی
اے چھجو، ایک پیسے کی میٹھی گولیاں۔

اے چھجو، ایک آنے کے گڑ کے سیو

ان سب نے غوغائیوں کی طرح چاؤں چاؤں شروع کردی۔ چھجو کی باچھیں کھل گئیں۔ پڑوس کے شیخ صاحب کی بیٹیاں لگتا ہے چھٹیوں میں گھر آ گئی ہیں۔ اب کئی دن خوب بکری رہے گی۔

چھجو پہلے ہم آئے تھے۔ پہلے ہمارا سامان۔ ایک نسبتاً بڑا لڑکا ذرا کنارے کو کھڑا ہوا تھا۔ شرمیلا سا، ہکلا ہکلا کر بولتا ہوا۔

ہاں میاں۔ پہلے تمہیں لو۔ کیا چاہیے میاں

ایک پیسے کی کھریا، ایک قلم کا نرسل۔ اور ہاں اماں نے ڈیڑھ گز دھنک کے لئے بھی کہا تھا۔

ابھی لو میاں۔ چھجو نے ڈبہ کھڑکھڑایا تو سب سے پہلے گوٹے کا پیکٹ نکلا۔ چھجو نے گز اٹھایا۔

واہ میاں۔ مندر بھی ہوئی یا ئے صُبُو صُبو۔ انہوں نے لڑکے کی پیشانی پر لگے بڑے سے قشقے کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا اور دھنک کا قدرے اُلجھا ہوا تھان کھولنے لگے۔ یہ ڈیڑھ گز دھنک کا کیا ہوگا میاں......

اماں بھگوان جی کی اوڑھنی میں ٹانکیں گی۔

اچھا اچھا۔ چھجو نے اپنی ہلتی ہوکر گردن مزید ہلائی اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر چھوٹی سی زنگ آلود قینچی اُٹھائی اور ناپ کر دھنک کاٹی۔

اس وقت لفظ سیکولر اتنا رائج نہیں ہوا تھا اور لوگ اس کے ہندی اُردو مترادف ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں کیا کرتے تھے۔

اب چھجو نے اپنی چھوٹی چھوٹی چیاں جیسی آنکھوں سے بڑی محبت سے باقی بچوں کو دیکھا۔ رضیہ جو سب سے چھوٹی تھی اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے درمیان مسکرائی جواب میں جھجو بھی ٹوٹے دانتوں کے درمیان مسکرائے دھنک کا تھان دیکھ کر رضیہ کو اپنی گڑیا یاد آ گئی تھی اور اس کی موٹی موٹی آنکھیں تتلیوں کی طرح ناچ اٹھی تھیں۔

گڑیا کے دوپٹے کے لئے ہمیں بھی دھنک۔ اس نے اوپر کے دانتوں تلے ہونٹ دبا

کر کہا۔

اچھا اچھا۔ بٹیا کے ساتھ اس کی گڑیا بھی آئی ہے۔ اثبات میں رضیہ نے پلکیں جھپکائیں۔ چھجو نے بالشت سے ناپ کر دھنک کاٹی۔ پھر سب کی پڑیاں باندھیں۔ تام چینی کے پیالے میں شکر کی رنگ برنگی مچھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ زرد، گلابی، سرخ۔ ایک تیز گلابی مچھلی انہوں نے رضیہ کو دی۔ یہ چھجو کا خصوصی تحفہ تھا جو ننھی بٹیا کے لیے مفت تھا۔

رضیہ کو مٹھی بھر کے سوکھے جھانکڑ چھجو بہت پسند آئے تھے۔ انہوں نے اسے شکر کی مچھلی دی تھی وہ بھی اس کے پسندیدہ گلابی رنگ کی۔ شام کو کسی بچے نے رضیہ کو چڑایا" دنت ٹٹی۔ تیرے دانت چوہا لے گیا۔"

"آں۔ چھجو کے دانت بھی چوہا لے گیا۔"

"چل چھوٹی۔"

"نیس سچّی۔ جا کے دیکھ لو۔ چھجو کے ساتھ رضیہ کا بڑا زبردست آئیڈنٹی فکیشن ہوا تھا۔

رات کو جب مارے محبت کے نانی رضیہ کو بغل میں لے کر بیٹھیں تو رضیہ نے زبردستی ان کا منھ کھول کر دیکھا کہ نانی کے دانت چوہا لے گیا ہے یا نہیں اور پھر کہانی کی فرمائش کی۔ نانی اماں کہانی۔

چلو آج تمہارے چھجو کی ہی کہانی سنا دیتے ہیں۔ بڑی دوستی کر آئی ہو نا چھجو سے۔

چھجو کی بھی کہانی ہوتی ہے کیا؟ رضیہ کا منھ حیرت سے کھل گیا۔

چھجو تو آپ سے تھوڑا سا ہی بڑا ہوگا۔ اتنا زیادہ بوڑھا کیسے لگنے لگا۔ رضیہ کی امی نے پوچھا۔ ان کی پچپن چھپن سالہ امی بھاری بھرکم جسم اور چکنے چہرے کی وجہ سے اپنی عمر سے کم ہی نظر آتی تھیں اور بڑی چاق وچوبند اور دبنگ خاتون تھیں۔

دُکھیا۔ انہوں نے سونف اور کدوکش کیا ہوا ناریل منھ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ کھانے کی مار ہمیشہ رہی اس پر سے اتنے چینگی پوٹے۔ بیوہ بہو۔

رضیہ کے لئے کہانی کھانے کی مار اور بیوہ بہو سے قطعی عبارت نہیں تھی اس لئے وہ ٹھنکی ۔کہانی سنایئے نہ نانی۔ چھجو کی کہانی۔ پھر وہ گول گول ہو کر نانی کی گود میں دبک گئی جو جاڑوں میں بڑی نرم گرم تھی۔ چھجو بیچارے تو چھیدوں والا ہاف سوئیٹر پہنے جوان کی واحد جڑاول تھا گھٹنوں میں

سر دے کر گول گول سے ہو کر دوکان بلکہ ڈکینا میں بیٹھے رہتے تھے۔ دانت نہیں تھے اس لئے مسوڑھے تھر تھر کرتے رہتے۔ اماں بتاتی تھیں ۔...... نانی نے کہانی کا آغاز کیا۔ رضیہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی۔

نانی اماں ۔ کیا آپ کی بھی اماں تھیں؟ رضیہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ اماں تو چھوٹے بچوں کی ہوتی ہیں یا پھر بہت ہُوا تو امی جیسی کسی نوجوان اور خوبصورت سی عورت کی ۔ اس لیے امی کی اماں تک تو ٹھیک ہے لیکن کھچڑی بالوں والی یہ موٹی سی عورت کسی کی بٹیا کیسے ہوسکتی ہیں وہ تو بس نانی ہیں ۔ پیدائشی اور ازلی۔

بیچ میں ٹوکا تو کہانی ختم۔ نانی نے میٹھی جھڑکی دی اور رضیہ پھر ان کی گود میں پھیل گئی

''اماں بتاتی تھیں کہ چھجو کی اماں پتھر توڑا کرتی تھی ......''

''نانی وہ پتھر کیوں توڑتی تھی ......'' رضیہ پل کے پل میں اپنا وعدہ بھول چکی تھی۔

نانی ہنس پڑیں۔ یہ نہیں باز آنے کی۔ پتھر یوں توڑتی تھی بٹیا کہ اسے پتھر توڑنے کے پیسے ملتے تھے جن سے وہ آٹا، دال، نون تیل لاتی تھی۔

آپ کی اماں بھی پتھر توڑتی تھیں نانی؟

نانی اُلار ہو گئیں۔ اوئی نوج بچی۔ خدا نہ کرے۔ میری اماں تو تحصیل دار کی بیٹی تھیں۔

نانی ۔ آپ نے اوئی نوج، خدا نہ کرے کیوں کہا۔ اور آپ کی اماں پتھر نہیں توڑتی تھیں تو آٹا دال، نون تیل کہاں سے لاتی تھیں۔ رضیہ کی زبان میں کھجلی ہوئی اور اس نے چاہا کہ وہ یہ سب کچھ پوچھے لیکن ڈر سے خاموش رہی۔ صرف اتنا ہی کہا۔ پھر نانی اماں؟

پھر یہ بٹیا کہ اس کے بچے مر جایا کرتے تھے۔ سب سے آخر میں چھجو پیدا ہوتو اس نے چھجو کو چھاج میں رکھ کر گھسیٹا اور اس کا نام چھجو پڑ گیا۔

رضیہ اپنی ننھی معصوم آواز میں کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔ نانی اور اس کی امی کے دل میں یہاں سے وہاں تک پھول ہی پھول کھلتے چلے گئے۔ ایسی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ہنسی۔ ایسی خالص اور شفاف ہنسی۔ یہ ہنسی تو بس فرشتے ہی ہنس سکتے ہیں۔ یا معصوم بچے کہ دنیا کو انہوں نے جانا ہی نہیں ہوتا ہے۔

بڑا مزا آیا آپ کو رضیہ بی۔ رضیہ کی امی نے سوئٹر بنتے ہوئے کہا اور مسکرائیں۔

چھجو اب بھی ایسے لگتے تھے کہ چھاج میں سما جائیں۔ کچھ بڑے ہو گئے تھے تو اپنی ماں کے ساتھ پتھر توڑنے لگے تھے۔ پتھر توڑتے توڑتے عمر کے ساتھ گھس گئے تو نہ جانے کیسے کیسے قرض دام کر کے یہ چھوٹی سی دوکان کھولی۔ وہیں ٹاٹ بچھا کر پڑ رہتے۔ بڑا بے ضرر سا چہرہ اور اس سے بھی زیادہ بے ضرر جسم لئے۔

رضیہ یا تو نانی کی نرم گرم گود میں گھسی، بلی کے بچے کی طرح اُون کے گولے سے کھیل رہی تھی یا اچانک کود کر بھاگی۔ اسے دوسرے کمرے میں ماموں کے ساتھ شطرنج کھیلتے بچوں کو یہ اہم اطلاع دینی تھی کہ چھجو کا نام چھجو اسلئے پڑا تھا کہ وہ چھاج میں رکھ کر گھسیٹے گئے تھے۔ رضیہ کا جی چاہا وہ پھر اسی طرح گھسیٹے جائیں اور سارے بچے تالی بجا کر تماشہ دیکھیں۔

اماں وہ چھجو کے بیٹے کو کیا ہو گیا تھا۔ سنا تھا کہ مر گیا۔ کیا بھلا سا نام تھا بے چارے کا سراج الدین۔ رضیہ کی امی نے پوچھا۔

ہاں مولی صاحب نے تو نام سراج الدین ہی رکھا تھا مگر چھجو کی بیوی نے چونکہ اسے رام پرشاد ساؤ کے ہاتھ دو پیسے میں بیچ دیا تھا۔ اس لیے بچن ہی کہلاتا رہا۔ بہت دنوں تک ہمارے یہاں کا سودا سلف لاتا رہا۔ تم اس وقت رضیہ سے بھی چھوٹی تھیں۔ پھر تمہارے اسکول کا ٹھیلہ چلانے لگا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد انہیں رام پرشاد ساؤ نے چھجو کو بغیر سود کا قرض دیا تھا تا کہ وہ یہ دوکان کھول سکیں۔ چھجو دکھیا کے گھر تو بھونی بھانگ بھی نہیں تھی۔

رضیہ کی امی کو اپنے اسکول کا ٹھیلہ یاد آ گیا۔ ایک بڑے سے مہیب ڈبے جیسا۔ چاروں طرف پردے، آگے بیل گاڑی جیسے بم جن میں بیلوں کی جگہ ایک آدمی جُتا ہوا ہوا کرتا تھا۔ ایک اور آدمی پیچھے سے دھکا دیتا تھا۔ ذرا سا توازن بگڑا نہیں کہ ٹھیلہ یوں اُلار ہوا جیسے مڈل کلاس کا بجٹ۔ اندر بیٹھ کر لگتا تھا مقبرے میں بند ہیں۔ برقعہ پہن کر لڑکیاں اندر بیٹھتی تھیں۔ پھر بھی ذرا کی ذرا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا نہیں کہ چھجو کے صاحبزادے بچن نے ڈپٹا۔ 'پردہ گرائیے بٹیا۔ قرینے سے بیٹھئے۔' ہندو لڑکیاں پردہ نہیں کرتی تھیں لیکن کیا مجال کہ وہ بھی جھانک لیں۔۔ ماتا جی سے جا کے کہہ دیں گے کہ پردہ کھول کھول کر منہ باہر نکال رہی تھیں۔ بچن انہیں بھی ڈپٹتے۔ کسی بھی ماتا جی کو بیٹی کا پردے سے باہر منہ نکال کر سڑک پر جھانکنا قطعی پسند نہ آتا۔ اور یہ بات ہر بیٹی کو اچھی طرح معلوم تھی۔

خدا کا شکر کہ یہ ٹھیلے والی لعنت بہت جلد ہی ختم ہو گئی۔ آدمی کے کندھوں پر زندہ آدمی۔ لیکن کیا بچپن کے سر پر سے آدمی اُتر گئے؟ وہ جو سب کے ہاتھوں بک چکا تھا ایک دن جوانی میں ہی کیڑے مکوڑے کی طرح مر گیا۔

اسکول کی نوکری چھوٹنے پر وہ ٹرین میں کوئلہ جھونکنے والے خلاصی کی نوکری کرنے لگا تھا۔ ایک دن چلتی ٹرین میں دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھڑا ہوا تھا کہ توازن گڑ بڑایا اور وہ نیچے گر پڑا رنج نے چھجو کو کچھ اور دُبلا کر دیا لیکن جسم کا وزن کم ہونے کے باوجود ان کے شانے جھک گئے۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے سر پر منوں وزنی جھوا رکھ دیا ہے اور وہ اس کے بوجھ تلے بیٹھے جا رہے ہیں۔ کسی نے جھوے کے اوپر پڑا میلا سا کپڑا ہٹا کر نہیں دیکھا کہ اس کے اندر کتنے دُکھ بھرے ہیں۔

اچھلتی کودتی رضیہ پھر نانی کے پاس لوٹ آئی تھی۔ اس کی امی نے پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کے جھبرے بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔ سونے سے پہلے وہ اس کے گھنے بال سمیٹ کر اس کا سر گوندھا کرتی تھیں جو رضیہ کے لیے ایک سخت ناپسندیدہ عمل تھا لیکن آج وہ خاموشی سے سر گوندھواتی رہی۔ اس لیے کہ وہ دوسرے دن صبح چھجو کی دوکان پر جانے اور اسے یہ بتانے کے خیال سے بے حد خوش تھی۔ 'چھجو۔ چھجو تمہیں چھاج پر رکھ کر گھسیٹا گیا تھا'

دوسرے دن جب اس نے یہ پسندیدہ جملہ دوہرایا تو چھجو کی مسکراہٹ ایک کان سے دوسرے کان تک رینگ گئی۔ کالی کالی چیاں سی گدلی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ کسی پری کتھا کے نیک دل بوڑھے جیسے لگنے لگے۔

ہاں بٹیا۔ انہوں نے ایسے لہجے میں حامی بھری جیسے چھاج رکھ کر گھسیٹا جانا بڑے فخر کی بات ہو۔

چھجو۔ چھجو۔ تمہاری اماں کے بچے مر جایا کرتے تھے۔

ہاں بٹیا۔ سنا تو یہی تھا۔

چھجو۔ چھجو۔ تمہاری اماں کے بچے مر کیوں جاتے تھے؟

چھجو کو قطعی معلوم نہیں تھا۔ نہ ہی ان کی اماں کو کبھی معلوم ہو سکا تھا کہ اسے کچھ ایسی نلسوانی شکایت تھی کہ حمل اور زچگی کے دوران اسے خصوصی دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ وہ کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی تھی۔ ہسپتال میں زچگی کا اس کے پاس کوئی تصور نہیں تھا حمل اور زچگی تو ہر

عورت کا فطری مقدر تھے بیماریوں میں ان کا شمار تھا بھی نہیں۔ وہ تو سچ مچ بیمار پڑنے پر بھی کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکی تھی۔ اسے یہ بھی کبھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ چھجو محض اتفاق کے تحت بچ گیا تھا۔ چھاج پر رکھ کر گھسیٹے جانے کی وجہ سے نہیں۔

لیکن اس کے قبیل کے لوگ اتفاق کے تحت ہی جیا کرتے تھے۔ اس لیے چھجو نے رضیہ کو جواب دیا' پتہ نہیں بٹیا' اور دل میں سوچا۔ میرا بیٹا بھی تو مر گیا۔ میری عورت نے اسے رام پرساد ساؤ کے ہاتھ دو پیسے میں بیچا اس کی شادی میں ساری رسمیں ساؤ جی کی بی بی سے کروائیں پھر بھی وہ مر گیا۔ اس نے اللہ میاں سے کئی بار سوال کیا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا لیکن اللہ تعالی اپنے دستور کے مطابق خاموش رہے۔

''چھجو۔ چھجو' ہم یہاں بیٹھیں؟''

چھجو گڑ بڑا گئے۔ یہ جگہ اپ کے بیٹھنے لائق نہیں ہے بٹیا۔ یہاں کہاں بیٹھیں گی۔

اُوں...... اتنی جگہ تو ہے۔ رضیہ ٹھنکی۔ لائق اور نالائق کا اسے کوئی علم نہیں تھا اس لیے کہ یہ علم دنیا بہت دھیرے دھیرے آگے چل کر سکھاتی ہے۔

چھجو۔ ہمیں کہانی سناؤ۔ لائق اور نالائق کو قطعی نظر انداز کر کے وہ کسی خرگوش کی طرح اُچک کر اوپر چڑھ گئی تھی جہاں چھجو نے ایک پھٹی بوری کو تہہ کر کے بچھا رکھا تھا۔ سامان لے کر سارے بہن بھائی شور مچاتے واپس ہو گئے تھے۔ گھر چند قدم کے فاصلے پر تھا اور چھجو محلے کے پرانے آدمی تھے اس لیے رضیہ کو وہاں چھوڑنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سو رضیہ ننھے منے ہاتھوں کے ننھے پیالے میں بڑی بڑی معصوم آنکھوں والا چہرہ لیے چھجو کی دوکان میں پھیل کر بیٹھ گئی۔ چھجو ذرا سا اور سکڑ گئے۔ دراصل ان کے سکڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہی دنیا میں اتنی جگہ نکلتی تھی کہ باقی لوگ آرام سے پھیل کر رہ سکیں۔

چھجو نے رضیہ کی کہانی سنائی۔ اس کہانی میں وہ سب تھا جو چھجو کے پاس نہیں تھا۔ سرسبز باغ، محل، پھلوں سے لدے درخت۔ انواع واقسام کے کھانے۔ ریشمی لباس والے خوش وخرم صحت مند لوگ جن کے پاس دولت تھی اور دولت سے حاصل ہونے والا اقتدار۔ کہانی سنا کر چھجو نے رضیہ کو اب کی شکر کی دو مچھلیاں دیں ایک سبز اور ایک سفید۔ ان کے بوریے پر بیٹھ کر، ان میں اتنی دلچسپی ظاہر کر کے، انہیں اتنی عزت ومحبت دے کے اس ننھی بچی نے انہیں کچھ فخر کرنے کا موقعہ

دیا تھا۔ پھر انہوں نے اس کی انگلی پکڑی اور گھر تک چھوڑنے آئے۔ پھر راستے میں کہیں وہ وقت کے لہریں لیتے سمندر کے پانیوں میں نمک کی طرح تحلیل ہو گئے۔

ننھی رضیہ کو کبھی یہ یقین کرنے میں دقت ہوئی تھی کہ نانی کی بھی اماں ہو سکتی ہیں اور اب ادھیڑ عمر رضیہ کے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اتنا وقت گذر چکا تھا۔ جو ننھی بچی دوہری تہہ کی ہوئی، گھسی ہوئی بوری پر بیٹھ کر اپنے ننہال کے ایک کردار چھجو سے کہانیاں سنا کرتی تھی اور شکر کی رنگین مچھلیاں کڑ کڑ کر کے چباتی تھی اس میں اور آج کی رضیہ میں، جواب خود آپ نانی ہے، کیا کہیں کوئی رشتہ ہے یہ سمجھ سے پرے کی کوئی بات معلوم ہوتی تھی۔ ذہن میں بچھی ریت کے ان گنت ذرے چمکتے تو کبھی کبھی ان میں وہ لڑکی بھی دکھائی دیتی اور بہت سے لوگوں کے ہجوم میں چھجو بھی کبھی کبھی نظر آ جاتے۔

بہت دنوں سے رضیہ کی نواسی ضد کر رہی تھی کہ نانی اماں اس کے گھر آئیں۔ رضیہ کی نانی کبھی اس کے گھر نہیں آئی تھیں۔ اس زمانے میں بیٹی کے گھر کا پانی نہیں پیا جاتا تھا لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔ لوگ جہاں اور جیسا ملے پانی پی لیا کرتے تھے اور بہت سا پانی مر چکا تھا۔

رضیہ کے داماد افسر تھے۔ ہرے بھرے شاداب درختوں سے گھری سڑک پر دورویہ بنے سرکاری بنگلوں میں سے ایک بنگلے میں ان کی رہائش تھی۔ ان رہائش گاہوں کے درمیان اندر جاتی سڑک کے نکڑ پر آ یک اُٹنگے سے تخت پر لگی دوکان جسے بڑے ماموں اگر زندہ ہوتے تو ڈکنیا، کہنے پر مُصر ہوتے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہو رہی تھی۔ ٹاٹ کے پیوند تو ساری کی ساری مخملی دنیا میں پیوست ہیں اور لوگ ان کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ اِلّا چند سٹھیائے ہوئے لوگوں کے جو انہیں کبھی کبھی کہانیوں یا گفتگو کا موضوع بناتے ہیں یا پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بدصورتی کے درمیان حسن اور حسن کے درمیان بدصورتی خود بخود اجاگر ہو اٹھتے ہیں اور نظریں ان پر چلی ہی جاتی ہیں۔

بنگلوں کے درمیان وہ دوکان کچھ ایسی ہی انمل بے جوڑ تھی۔

تخت پر رکھی دو تین چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں کچھ سبزیاں تھیں۔ کچھ مرتبان رکھے ہوئے تھے۔'' کچھ بسکٹ کے پچکے ہوئے ٹین بھی تھے۔ تخت کے پائے سے ایک بکری بندھی ہوئی تھی۔ اس سارے کاٹھ کباڑ کے درمیان وہ بوڑھا بھی کاٹھ کباڑ کا ایک حصہ لگ رہا تھا جو غالباً

بطور دوکاندار وہاں بیٹھا ہوا ہتھیلیوں کے درمیان تمبا کو مل رہا تھا۔ زندگی کے خزاں رسیدہ درخت سے جھڑا ہوا ایک پتہ جسے حضرت عزرائیل اپنی لمبی سی جھاڑو سے سکیر کر ہٹانے کے انتظار میں ہوں۔ بڑا اداس اور تنہا منظر تھا۔ یا کچھ ایسا ہوتا ہے کہ کسی نامعلوم کیمیائی اثر کے تحت ادھیڑ عمر لوگوں کو بہت سے مناظر ایسے ہی لگنے لگتے ہیں۔ تنہا اور اداس۔ اور وہ سرسر کر کے ریت کی طرح پھسل چکے وقت میں پاؤں ڈبو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ رضیہ کا جی اداس ہوتا تو ماضی تصویر کی طرح سامنے چلنے لگتا۔

امروہہ ضلع مرادآباد کے چھجو، مٹی جن کی ہڈیاں تک قبر میں چاٹ چکی ہوگی یہاں کہاں سے آ گئے؟ مشرقی یو۔ پی کے شہر جون پور میں اور کیا انہیں فنا نہیں تھی کہ اب تک ویسے کے ویسے ہی بیٹھے رہ گئے تھے؟

ناشتے کی میز پر رضیہ نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔ بھلا اس دوکان سے یہاں کون سودا خریدتا ہے؟

کس دوکان سے ممی؟

ارے یہی۔ وہ تمہاری تخت پر لگی ڈکنیا جس پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔

رضیہ کی بیٹی ہنسنے لگی۔ ارے وہ بڑے کام کی دوکان ہے ممی۔ وقت بے وقت سبزی ختم ہو جائے، کبھی کسی کو ہلدی مرچ کی ہی ضرورت پڑ جائے تو ملازم کو دور شہر کے بازار تک دوڑانا نہیں پڑتا۔ اور پھر ہمیں تو اس دوکان سے کچھ زیادہ ہی فائدہ ہے۔ کیوں ٹھما؟ رضیہ کی لڑکی نے اپنی چھ سالہ بیٹی کی طرف شرارت سے دیکھا۔

سبزی والے بڑھوٗ سے ٹھما کی بڑی دوستی ہے۔ بلکہ ابھی تک یہاں ان کی کسی اور سے کوئی دوستی نہیں ہوئی۔

کیوں بھئی؟ اور کوئی دوست کیوں نہیں ملا؟

'ہم لوگ ابھی یہاں نئے ہیں نہ ممی۔ آس پاس جو لوگ ہیں ان کے یہاں رضیہ کے ہم عمر بچے نہیں ہیں۔ ابھی یہ اس کالونی کو 'دریافت' کرنے کے مرحلے سے گذر رہی ہیں۔' رضیہ کی بیٹی نے بڑی محبت سے اپنی بچی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

تمہارے اس دوست کا نام کیا ہے بھئی۔ رضیہ نے نواسی سے پوچھا۔

چھجو!

قبر سے ہاتھ نکال کر بڑے ماموں نے بادا موں کی پڑیا لقمائی جس میں ایک چونی بھی تھی۔ رضیہ کے اندر سے ایک چھوٹی سی بچی، جو شاید ہر ادھیڑ عمر انسان میں چھپی بیٹھی ہوئی ہے کود کر باہر آ گئی اور تحیر آمیز مسرت کے ساتھ چیخی—— چھجو!

نانی، ھُما کہہ رہی تھی۔ ہم انہیں چڑاتے ہیں چھجو ساؤ۔ دانت دکھاؤ...... ان کے منہ میں دانت ہیں ہی نہیں۔ مگر وہ ذرا نہیں چڑتے۔ ہنس کر منہ کھول دیتے ہیں۔ ایک یہ ہیں منن خاں۔ اس نے سامنے سے آتے چپراسی کو دیکھ کر کہا۔

بٹیا۔ اب کی آویں تمہرے چھجو ساؤ تو ہم ڈنڈا لے کے دوڑالیں گے۔ الٹی سیدھی کہبت سکھلا کے جاتے ہیں۔

ہاہاہا—— ھُما اپنی معصوم آوازیں قہقہہ لگا کے ہنسی۔ ''مٹر کی پھلیاں دانے دار، منن کو لے گیا تھانے دار۔ منن کو لے گیا تھانے دار......

دیکھ لیجئے بیگم صاحب۔ وہی بڑھؤ سکھلا کے گئے ہیں؟ منن خاں نے ھما کی امی کو مخاطب کیا۔ ھُما بٹیا...... نانی کو بتاؤ تمہارے چھجو ساؤ کا نام چھجو کیوں ہے۔ ھُما کی امی نے منن خاں کی شکایت ٹالنے کی غرض سے بات کا رخ موڑا۔

چھجو ساؤ کی اماں کے بچے مر جاتے تھے تو انہوں نے چھجو ساؤ کو چھاج پر رکھ کر گھسیٹا

رضیہ نے بات کاٹ دی...... مجھے معلوم ہے بٹیا......

آپ کو کیسے معلوم نانی اماں......

یہ میرے ننہال میں پیدا ہوئے تھے بٹیا۔

ننہال کیا ہوتا ہے نانی؟

نانی کا گھر۔

آپ کی بھی نانی تھیں نانی اماں؟ کیا نانی کی بھی نانی ہوتی ہیں کہیں؟ ھُما کی آنکھیں حیرت سے گول ہو گئیں۔

یہ تو اب خود میں بھی نہیں سمجھ پاتی کہ میری بھی نانی تھیں کبھی۔ رضیہ نے دل ہی دل میں کہا پھر رسان سے بولی۔ چھجو کا بیٹا ٹرین سے گر کر مر گیا۔ پہلے اسکول کا ٹھیلا کھینچا کرتا تھا۔

نہیں ممی ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔ یہ آپ سے کس نے کہا! مگر ہاں ایک حادثہ ہوا ضرور ہے اس کے یہاں ۔ اس کی بیٹی کو سال بھر کے اندر سسرال والوں نے جلا کر مار دیا۔ بڑی خوبصورت تھی اور باپ کی بہت خدمت کیا کرتی تھی۔ رضیہ کی بیٹی نے بغیر کسی تاسف کے اطلاعاً بتایا۔ بات پرانی ہو چکی تھی اس لیے غیر متعلقہ لوگوں کی وقتی ہمدردی کا ابال بیٹھ چکا تھا کہ پرانے غم بہت جلد اپنی کاٹ کھو دیتے ہیں مگر صاحبِ غم کے لئے وہ کبھی مدھم نہیں پڑتے۔

''چھجو کی وجہ سے ھُما ہری سبزیاں کھانے لگی ہے جو پہلے کبھی نہیں کھاتی تھی۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں کہ ہری سبزیاں کھانے والے بچوں کے لئے پریاں تحفے لاتی ہیں۔''

ہاں نانی۔ پری ہمارے لئے لال امرود لائی تھی...... ھُما نے فخر سے اطلاع دی

ھُما کی امی دل ہی دل میں ہنسیں۔ چھجو کے آنگن میں لگے امرود کے درخت میں بڑے میٹھے لال امرود پھلتے ہیں یہ انہیں معلوم تھا۔

ممی...... کل چھجو ساؤ نہیں آئے۔

''وہ اپنی بیٹی کی سسرال گئے تھے جسے جلا کر مار ڈالا گیا۔ وہ ہفتہ بھر کی بچی چھوڑ کر مری تھی۔ دادھیال والے اسے چھجو کے یہاں نہیں آنے دیتے۔ یہ بے چارے کسی نہ کسی طرح کچھ پیسے پس انداز کر کے اس کے لئے تحفے تحائف لے کر جاتے رہتے ہیں۔ داماد دوسری شادی کر چکا ہے۔ اس کی بیوی کو اپنی بیٹی کہہ کر اس کے لئے بھی کچھ لے جاتے ہیں کہ اس کا دل بچی کی طرف سے نرم رہے۔ جاؤ تم جا کے اپنا ہوم ورک ختم کرو۔ شام تک آ جائیں گے چھجو۔ صبح دوکان پر تھے۔''

شام کو واقعی پہنچ گئے تھے چھجو۔ ٹوکری میں سبزی تھی کہ شاید بیگم صاحب کچھ خریدیں۔ میلے گمچھے میں دو خوش رنگ امرود تھے جو پری نے انہیں ھُما کے لئے دیے تھے۔ ھُما اس وقت بنگلے کے پچھواڑے کیلے کے درختوں کے جھنڈ کے پاس منن خاں کو تنگ کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی امی اپنی والدہ یعنی رضیہ کے ساتھ ٹہل ٹہل کر خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ ملائم اونی شالیں انھوں نے کاندھوں سے لپیٹ رکھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی جنت میں تھے اور دنیا بخیر تھی۔

کیا ہوا چھجو ساؤ؟ نواسی سے مل آئے؟ ھُما کی امی کی نظر ان پر پڑی تو انہوں نے

سوال کیا

''اس بار تو ان لوگوں نے ملنے بھی نہیں دیا۔ ایسے ہی دُور سے دیکھ کر لوٹ آئے بیگم صاحب۔'' ان کے جسم میں رعشہ تھا اور گردن کچھ زیادہ ہل رہی تھی۔ سبزی کی ٹوکری انہوں نے گھاس پر رکھ دی اور انگوچھے کی گرہ کھولنے لگے۔ منی بٹیا کہاں ہیں! مٹر بہت اچھی آئی ہے۔ سستی بھی ہوگئی ہے لیں گی؟ انہوں نے ترازو باٹ سنبھالے۔

مٹر ہے چچھو۔ ھُما کی امی نے نرمی سے کہا۔ انھوں نے ترازو باٹ واپس رکھ دیے۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔ منی بٹیا کو بلا دیجئے۔ ان کی آواز میں آنسوؤں کی لرزش تھی۔

اب کی رضیہ نے نظر بھر کر انہیں اچھی طرح دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی تھے۔ منحنی سے ۔گھسے ہوئے۔ جگہ جگہ سے اُڑے ہوئے۔ ٹھڈی پر سفید بالوں کی کھونٹیاں جیسے چیونٹی کے انڈے۔ ان کی واحد جڑاول ایک چھیدوں والا پھٹا سوئٹر تھا جو کثرت استعمال سے یقیناً اپنی گرمی کھو چکا ہوگا اور کون جانے انہیں بھی اپنے باپ سے ورثے میں ملا ہو۔ ہاں یہ وہی تھے امروہہ ضلع مراد آباد کے چچھو۔ جڑواں بچوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لئے جیسے کوئی نشان بنا دیا جائے ایسے ہی قشقہ ان کی پیشانی پر کھینچا ہوا تھا۔ اتنے دُکھ اُٹھا کر بھی خدا سے ان کا یقین نہیں اٹھا تھا۔ وہ مندر ہوتے ہوئے لوٹے تھے اس لیے بالکل تازہ تھا۔ تازہ اور اُجاگر۔ لیکن کیا قشقے کے ہونے نہ ہونے سے زندگی کی کہانیاں الگ ہو جاتی ہیں؟

☆☆

فدا علی، کریلے اور اُردو

نوادرات کا وہ دلال پھر آیا تھا۔ سنگ مرمر کی جالی کے ڈیڑھ لاکھ گیا گیا تھا۔ تفضل حسین راضی نہیں ہوے۔ وہ ڈھائی سے نیچے اترنے کو تیار نہیں تھے۔ ابتدا تو چار سے کی تھی۔ عظمتِ رفتہ کے دام اب اور کتنے گریں گے؟

''ہائی پاپا۔''

ان کی بڑی لڑکی سمیرہ ٹینس ریکٹ ہلا کر انہیں جدید سلام کرتی ہوئی گذر گئی۔ آج سنیچر کی شام ہے۔ سمیرہ ٹینس کھیلنے جاتی تھی اور وہاں سے سیدھی والدین کے یہاں آجایا کرتی تھی۔ اس کے شوہر اسی شہر میں کامیاب وکیل ہیں۔ دیر سویر وہ بھی آجائیں گے اور رات کا کھانا حسب دستور سب اکٹھے مل کر کھائیں گے۔ آج کل رونق میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ سمیرہ کے دونوں بچے دلی سے گھر آئے ہوئے تھے جہاں وہ بورڈنگ اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ گرمی کی طویل چھٹیاں تھیں۔

زینت آپ بڑی خوش قسمت ہیں۔ سید تفضل حسین نے جو دوست احباب کے درمیان ٹُو ٹُو حسین کہلاتے تھے اور اپنی اچھی صحت اور خوش وخرم زندگی کے سبب قابلِ رشک سمجھے جاتے تھے، بیوی کو مخاطب کر کے یہ جملہ کئی بار دوہرایا تھا کیوں کہ ان کی عمر کے زیادہ تر جوڑے انتہائی تنہا، بے زار اور بور ہو چکے تھے۔ ان کے اپنے بیٹے سات سمندر پار سے ٹیلی فون پر سنائی دینے والی آوازوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ پھر بھی زندگی میں چہل پہل باقی تھی۔ اور اس چہل

پہل کا بڑا حصہ شہر میں سمیرہ کی موجودگی سے عبارت تھا۔ بڑھاپے میں میاں بیوی بالکل ہی اکیلے ہو جائیں تو یا تو ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے گذرتی ہے یا اس خوف میں کہ ایک مر گیا تو دوسرے کا کیا ہوگا۔ ویسے زینت حسین خود بھی ایک بڑی فعال خاتون تھیں۔ بہت سی سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں جن میں اُردو کی بقا و ترویج کے لیے کام کر رہی ایک انجمن کی سرپرستی بھی شامل تھی۔ انجمن ایک سنڈے اسکول چلاتی تھی جس میں بیک وقت پانچ سات طلبہ ضرور آجاتے تھے۔ عموماً دو تین مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتے۔ انجمن کے اراکین پانچ دس پھر پکڑ لاتے۔ گرمی کی تعطیلات میں یہ تعداد کچھ بڑھ جاتی تھی اس طرح اوسط برقرار رہتا تھا۔ حال ہی میں ان لوگوں نے دو کانوں، دوسری تنظیموں اور دفتروں وغیرہ کے بورڈ اور ناموں کی تختیاں اردو میں لگوانے کی مہم بھی چلائی تھی۔ اس میں زینت بیگم تندہی سے حصہ لے رہی تھیں۔ آج وہ ذرا دیر سے لوٹی تھیں اور منھ ہاتھ دھو کر سیدھی کھانے کے کمرے میں آ گئی تھیں۔ کھانے کی میز پر سمیرہ خان ساماں کو چھیڑنے میں مصروف تھی۔ جن کی بڑی روائتی چڑ تھی کریلے۔ گرچہ وہ نہایت لذیذ قیمہ بھرے کریلے پکایا کرتے تھے۔

''ماشاء اللہ سمیرہ بی بی بال بچوں والی ہوگئیں۔ ہم اس ڈیوڑھی پر بڈھے ہو گئے مگر چھیڑنے سے باز نہیں آتیں۔'' فدا علی منمنائے۔

دونوں ٹین ایج بچے زور سے ہنسے۔ ''فدا علی کریلے۔ فدا علی کریلے۔ ارے ہم آپ کو چڑا نہیں رہے ہیں۔ ہم تو کریلے اِدھر مانگ رہے ہیں''۔

فدا علی کو معلوم ہے بچے کریلے قطعی نہیں کھاتے۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ اُردو قطعی نہیں پڑھنا چاہتے۔ لاکھ بیگم صاحبہ کہیں۔ یوں تو سمیرہ بی بی نے ہی کون سی اُردو پڑھ کے دی۔ مولوی صاحب رکھے گئے تو ان کی کُرسی میں گوند انہوں نے لگایا۔ ڈونگے میں مینڈک کے بچے بند کر کے ڈونگا پیش کیا۔ مولوی صاحب کو ایک دن کھیر کھلائی گئی تو سمیرہ بی بی اور سیف بھیا نے ان سے کہا کہ کھیر بلّی نے جھوٹی کر دی تھی اس لیے انہیں دی گئی ہے۔ اور بھی جو ماسٹر صاحب اُردو کے لیے رکھے گئے انہیں بھگا دیا۔ اب کبھی قرآن پڑھنا ہوتا ہے تو یا انگریزی ترجمہ پڑھتی ہیں یا ہندی۔ اور بیگم صاحبہ ہیں کہ آج کل فدا علی کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ ارے فدا علی علم تو کسی بھی عمر میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تم روز شام کو مجھ سے اُردو پڑھا کرو (انجمن کے

اعداد و شمار میں اضافہ ہو جائے گا)۔

''ارے بھائی یہ انجمن محبانِ اُردو کی طرف سے کارڈ آیا ہے۔ فراق پر سیمنار کر رہے ہیں اور مشاعرہ'' تفضل حسین کچھ دیر سے اپنی بانسری الگ ہی بجا رہے تھے۔

بے چارے محبان اپنے مستقل پروگراموں کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے رہتے تھے۔ چھوٹے بڑے مشاعرے، سیمنار، جلسے۔ کبھی کبھی کسی کو پکڑ لاتے کہ اُردو کے سیکولر کردار پر تقریر کرے اور لوگوں کو یہ باور کرائے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اور بدیسی تو قطعی نہیں (لے سنو، یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے'' زینت کی ایک پنجابی دوست راجندر اہلو الیہ نے کہا تھا۔ راجندر غزلوں کی بڑی دلدادہ تھی۔ پنجابی نہ بولتی تو بڑی نفیس اُردو بولتی۔ زینت کی انجمن کے پروگراموں میں ضرور آتی لیکن اُردو با قاعدہ سیکھنے کے نام پر کنی کاٹ گئی)۔ پھر وہ بڑے طمطراق سے اپنی ان سرگرمیوں کی رپورٹ مقامی اُردو اخباروں میں چھپوایا کرتے تھے۔ یہ اخبار تفضل حسین کے قبیل کے لوگوں کے گھر عموماً مفت پہنچ جایا کرتے تھے اور عموماً ایک نظر ڈالنے کے بعد ردی کی ٹوکری میں چلے جاتے تھے۔ کبھی بغیر اس ایک نظر کے بھی۔ زینت کچھ استثنائی لوگوں میں سے تھیں۔ وہ اُردو کے دو اخبار قیمت دے کر منگاتی تھیں اور دوسرے لوگوں کو بھی ترغیب دیتی تھی کہ انہیں خریدیں۔ ''ارے بھائی اب اگر ہم بھی سرپرستی نہ کریں گے تو یہ بے چارے اخبار کہاں جائیں گے۔'' وہ انہیں پڑھتی بھی تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ان کی جوانی کی تصویر کے ساتھ ان کی سماجی وادبی سرگرمیوں کی تفصیلات بھی شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً معروف سماجی کارکن محترمہ زینت حسین نے فرمایا...... زینت کے دونوں بیٹے جب یہاں تھے تو ممی کی اس احمقانہ فضول خرچی پر ناراض نہ سہی جز بز ضرور ہوتے تھے۔ اُتنے انگریزی اخبار اور رسالے گھر پر آتے ہیں۔ ان کے بعد ان میں پڑھنے کو کیا رہ جاتا ہے ممی؟'

کئی بار تفضل حسین نے بیوی کی حمایت کی تھی، ''صاحبزادے اپنی کمیونٹی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ بہت سے ملکی، سیاسی اور سماجی واقعات پر اپنی قوم کے ردعمل کا پتہ لگتا ہے۔ یہ چیزیں اکثر انگریزی اخبار' کور' نہیں کرتے۔ اور پھر میاں اپنی زبان کو ان اخباروں نے زندہ رکھ رکھا ہے۔ دیہاتوں کے بہت سے خواندہ افراد انہیں پڑھتے ہیں۔ شہر کے بھی کچھ مخصوص علاقوں میں ان کی کھپت ہے۔'' ان کے نوجوان بیٹوں میں اپنی قوم اور

زبان کے معاملات میں دلچسپی کا فقدان کیوں ہے اس کا تجزیہ تفضّل حسین نے نہیں کیا تھا۔ زبان اور قوم لازم وملزوم کیوں ہوگئی تھیں اس پر غور کرنے کا تو کچھ حاصل بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ اب تو ہو ہی چکی تھیں۔ محبانِ اُردو خواہ کتنے ہی لوگوں کو بلا کر تقریریں کروائیں۔

''اے ہے فدا علی۔ تم بھی سٹھیا گئے ہو۔ کتنا کہا کہ نہ چڑو نہ لوگ تمہیں چڑائیں۔ اب وہاں کہاں گھس گئے باورچی خانے میں۔ ارے بیٹھا کدھر ہے؟'' زینت نے پکار کر کہا۔

''کیوں بھائی چلو گئے تم لوگ یا کل کا کوئی اور پروگرام طے ہے؟'' اس ساری ہڑبونگ میں تفضّل حسین نے آواز اونچی کر کے پوچھا۔

''چل سکتے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔'' علی نے نیم رضا مندی ظاہر کی۔

فراق پر ہونے والے سیمنار میں آپ کس سے ملیں گے؟ زیادہ تر پاپا کے ساتھی ہوں گے یا کچھ چگی داڑھی گول ٹوپی والے مدرسہ نورالہدیٰ کے مولوی صاحبان۔ کتنے دن سے کہہ رہی ہوں کہ ساتھ چل کر پردے خرید لئے جائیں تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔''

شوہر کا جواب سنے بغیر سمیرہ نے ماں کو مخاطب کیا۔'' آپ اس راجستھانی نمائش میں گئیں؟ راجستھان اور گجرات کے خانہ بدوشوں کی روایتی کڑھت کی بہت خوبصورت چیزیں آئی ہوئی ہیں۔ لکڑی کا سامان بھی ہے۔'' سمیرہ کو ایتھنک (Ethnic) کا اتنا ہی خبط تھا جتنا آج کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے کسی بھی فرد کو۔ اس کا گھر مختلف ریاستوں کی روایتی آرائشی چیزوں، پردوں، کشیدہ کاری اور فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔

تفضّل حسین کچھ چڑ گئے۔ سب تمہاری طرح ادب بے زار نہیں ہیں۔ وہاں اچھے پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع ہوگا اور ہاں یہ سیمنار 'ساہتیہ کار' کی شرکت میں ہو رہا ہے۔ فراق صاحب کے نواسے کو بھی زحمت دی گئی ہے کہ وہ ان کی ذاتی زندگی کے کچھ گوشوں پر روشنی ڈالیں۔

سمیرہ خاموش ہوگئی۔ دل میں سوچا اب میں فراق کی ذاتی زندگی کے گوشوں میں جھانک کر کیا کروں گی۔ خیر پاپا کی دلشکنی نہ ہو۔ نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے ہیں۔ میں اب ایسی

ادب بے زار بھی نہیں ہوں۔ مشاعروں میں جاتی ہی ہوں۔ مہدی حسن، غلام علی، نصرت فتح علی اور جگجیت سنگھ کے سارے کیسٹ میرے پاس موجود ہیں۔ ہاں اُردو کو اوڑھنا بچھونا بناتی تو فری لانسنگ کر کے کیا اتنا کما سکتی تھی؟ آج شوہر سے الگ میری بھی اپنی کچھ ہستی ہے اور آمدنی بھی۔ ویسے یہ سارا کچھ دیکھا جائے تو ممی پاپا کا ہی دیا ہوا ہے بڑے روایتی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اعلیٰ درجے کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلوائی ہے۔ بڑے دوراندیش ہیں دونوں۔

زینت بیگم کی للکار پر فدا علی دوڑے چلے آئے تھے۔ نہایت ادب کے ساتھ انہوں نے کھانے کا آخری آئٹم پیش کیا۔ شاہی ٹکڑے۔ ''بیگم صاحبہ اس سے قبل کہ آپ کچھ بولیں، ہم پہلے ہی بتادیں کہ بھیا کی فرمائش پر شاہی ٹکڑے جلدی میں تیار کئے ہیں۔ ہم تو جارہے تھے 'پوٹین' بنانے۔ شاید شیرہ پوری طرح پیوست نہ ہوا ہو۔''

شیرہ کیا نہ ہوا ہو؟ فیض اور عالیہ نے بیک وقت پوچھا۔

جذب نہ ہوا ہو کہہ رہے ہیں بھیا۔

''ارے فدا علی ایسی شیرے جیسی گاڑھی اُردو مت بولا کیجئے۔ لایئے بڑھایئے قاب اِدھر۔'' یہ ——— علی تھے۔

''نانی امی۔ ہمیں ایک ڈھیلا ڈھالا پل اردو بن دیجئے جس میں کئی رنگوں سے جیومیٹریکل ڈیزائن بنے ہوئے ہوں۔'' زینت کا سولہ سالہ نواسہ فیض لاڈ سے کہہ رہا تھا لان پر پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر زینت کی سبک سی ٹوکری رکھی ہوئی تھی جس سے رنگ برنگے اون کے لچھے جھانک رہے تھے۔ ایک غیر ملکی رسالہ بھی ان کے درمیان ٹھنسا ہوا تھا جس میں بُنائی کے تازہ ترین ڈیزائن تھے۔ تپائی پر چائے کی ٹرے تھی سامنے کرسی پر تفضل حسین جلوہ افروز تھے جنہوں نے اردو کا ایک خالص ادبی پرچہ کھول رکھا تھا۔

''لیجئے زینت بیگم ایک اور نیا رسالہ۔''

''کیسا ہے۔؟''

''بہت اچھا۔ اس لیے بہت دن نہیں چلے گا۔''

''ان ارردو رسالوں کو اشتہار ملیں نہ قاری، چلیں گے کیا خاک۔''

نانی امی یہ اولمپک کا موتف میرے سوئٹر میں بنادیجئے گا۔ نواسی نے فرمائش کی۔ وہ

اس درمیان ڈیزائیوں کی کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی تھی۔ فیض نے نانا کے شانوں پر سے اُچک کر اولمپک کا موٹف دیکھنا چاہا۔ اس کی نظریں اُردو رسالے کے سرورق پر چھپی بڑی سی تصویر پر پڑیں۔ ''یہ کون ہیں نانا ابی؟'' جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے بہن کا منھ چڑایا۔ سوئٹر پر اولمپک کا موٹف بنوا کر اولمپک اسٹار ہی تو بن جاؤ گی۔ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ نکلے۔

تصویر علی سردار جعفری کی تھی۔

زینت اور تفضل حسین نے بیک وقت ٹھنڈی سانس لی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے یہ بے حد عزیز ''گرینڈ چلڈرن'' زیادہ تر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے حتیٰ کہ نانی امی سے بھی۔ انہیں اطمینان تھا۔ نانی اپنے وقت کی گریجویٹ ہیں۔ روانی سے بول نہ سکیں لیکن سمجھتی آرام سے ہیں اس لیے اُردو بولنے کی ضرورت جسے وہ ہندی کہا کرتے تھے، بہت کم پڑتی تھی۔

تفضل حسین ہولے سے بولے۔ کیا آپ بھی یہی سوچ رہی ہیں زینت بیگم کہ غلطی ہم سے کہاں ہوئی ہے؟ زینت کچھ نہیں بولیں۔ فراق والے سیمنار میں سمیرہ اور علی چلے تو گئے تھے واپس آکر سمیرہ نے کہا ''بہت چپٹے۔''

''کیا مطلب؟'' زینت کی تیوریوں پر بل تھے

''ارے چپٹ گئے مما اور کیا۔''

زینت کانوں سے ٹاپس اُتارنے لگیں۔ ''جنے کیا کہہ رہی ہو۔'' حالانکہ مفہوم انہوں نے سمجھ لیا تھا۔ علی کا کوئی کمنٹ نہیں تھا۔ داماد تھے اس لیے ساس سسر کا لحاظ کر رہے تھے۔ زینت نے ادبدا کر پوچھا تو بولے

''ہاں امی بہت مزا آیا۔ وشورنجن جی کی تقریر بڑی دلچسپ تھی۔ بڑی نفیس زبان بولتے ہیں۔'' بیڈروم میں سمیرہ نے شوہر کی کھنچائی کی۔ چاپلوس کہیں کے۔ اور مکار بھی۔

زینت فدا علی پر ناراض ہو رہی تھیں۔ کم بخت جھڑوس۔ گھنٹوں سے لاپتہ ہے۔ سودا لانے کو دے دیا۔ بس ہو گئے غائب غلہ۔ دراصل زینت کو کہیں نکلنا تھا اور فدا علی ندارد تھے۔

سمیرہ اور علی اتوار کی شب کو چلے گئے تھے۔ بچوں کو زینت نے روک لیا تھا۔ اس لیے کھانے کے لیے ہدایات دیے بغیر باہر نہیں جانا چاہ رہی تھیں۔

''لگتا ہے بڑھاپے میں کہیں عشق لڑا رہا ہے صورت حرام۔'' انہوں نے جلبلا کر کہا۔

سترہ سالہ عائشہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''ممی کو ایتھنک چیزوں کا خبط ہے اور نانی امی کو ایتھنک الفاظ کا۔'' زینت باوجود غصے کے مسکراہٹ ضبط نہیں کر سکیں اسی وقت دونوں شانوں سے زین کے بڑے بڑے مضبوط تھیلے لٹکائے ہانپتے کانپتے فدا علی نمودار ہوئے۔

کہاں غارت ہو گئے تھے فدا علی۔ میں تو سمجھتی تھی آج ضرور تم کسی موٹر ووٹر کے نیچے آ گئے۔

''آ ہی جائیں موٹر ووٹر کے نیچے تو بھلا ہو۔'' فدا علی بھی اپنی مالکن سے کم خراب موڈ میں نہیں تھے۔ گھنٹہ بھر سے سلمان میاں کی دوکان میں کھڑے کھڑے کھڑے..........''

''کیوں اس سلمان کے بچے کا کیوں دماغ خراب ہوا؟''

ارے بیگم صاحب آپ نے پرزہ دیا تھا اُردو میں لکھ کے۔ کافی دیر وہ اس پھیرے میں رہے کہ کوئی اُردو جاننے والا آن نکلے تو پڑھوائیں۔ بیسوں گاہک آن کے نکل گئے۔ آخر کو خود ٹو، ٹو کے پڑھا۔ کچھ تو اندازے سے ہم نے بتایا کہ کیا لکھا ہوگا اور کتنا۔ ہم بہت بگڑے۔ سرؔ جب اتنا پڑھ ہی لیتے ہو تو پہلے کوشش کرتے۔ ناحق میں کھڑا رکھا۔

زینت سخت حیران ہوئیں۔ پرچہ تو ہمیشہ اُردو میں ہی جاتا رہا ہے۔

دوکان پر بڑھوؔ بیٹھتے تھے نہ وہ ٹہل گئے۔ وہی پڑھتے تھے اُردو کا پرچہ۔ سلمان میاں نے کہلوایا ہے اگلی بار ہندی میں لکھ کر بھیجیں بیگم صاحب۔ نہیں تو پھر فون پر لکھوا دیں۔ دوکان میں فون لگ گیا ہے۔ یہ لیجیے نمبر۔ انہوں نے تھیلے دھم سے پٹختے ہوئے نمبر کا پرزہ زینت کو تھمایا۔

زینت پچھلے دنوں ایک شادی میں حیدر آباد گئی تھیں۔ وہاں دولہا میاں اُردو میں لکھا ہوا ایک خط لئے گھوم رہے تھے۔ ایک دوست کے ماں نے نیک خواہشات بھیجی تھیں۔ ''آنٹی اسے پڑھ دیجئے۔''

''کیوں تم خود کیوں نہیں پڑھ رہے؟''

''اُردو ہمیں نہیں آتی۔''

''شرم آتی ہے کہ وہ بھی نہیں آتی؟''

دولہا میاں ہی ہی کرتے بھاگ نکلے۔ وہ پیشے سے انجینئر تھے۔ کونونٹ ایجوکیٹڈ بلکہ آج کی اشتہاری اصطلاح میں 'کونونٹڈ' بھی نہیں تھے۔ کہ منہ میں زبان انگریزی ہو پھر بھی......

زینت دوسرے ہی دن سلمان میاں کے دوکان پر محبانِ اُردو میں سے ایک محبّ کو لے کر پہنچ گئیں۔

''اگلی بار میں آؤں تو بورڈ پر'' انورادھا اسٹور'' اُردو میں بھی لکھا ہوا ملے۔'' انہوں نے سلمان میاں کے ساتھ ذرا دبنگ لہجے میں بات کی۔

''بیگم صاحبہ ہم نے مصلحتاً نام رکھا انورادھا اسٹور۔ اب آپ اُردو میں نام لکھوا کر ساری مصلحت کا پڑا کروائیں گی۔''

''آپ کی مصلحت ہم سمجھ رہے ہیں۔ انورادھا بہت خوبصورت نام ہے۔ اپنی دھرتی سے جُڑنا بھی ایک خوبصورت بات ہے لیکن آپ اپنی زبان کیوں بھول رہے ہیں۔ تھوڑی سی مشق کر ڈالئے تاکہ کوئی گاہک اُردو میں پرچہ لے کر آئے تو کھڑا نہ رہے۔ اور دوکان کا بورڈ کل ہی...... دیکھئے جو خرچ آئے گا وہ ہم دیں گے۔''

''دیکھا جائے گا بیگم صاحبہ۔ آپ سامان کی فہرست پڑھئے۔''

''سامان تو کل ہی فدا علی لے گئے ہیں۔ یاد نہیں رہا کیا؟ ہم تو صرف یہی کہنے آئے تھے جو کہا۔''

''صرف یہ کہنے؟'' حیرت سے سلمان میاں کا منہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔'' خیر آپ نے قدمِ رنجہ فرمایا۔ یہ لیجئے الائچیاں۔'' انہوں نے مرتبان سے نکال کر دونوں خواتین کو الائچیاں پیش کیں۔

شکریہ۔ زینت نے الائچیاں لے لیں۔

زبان تو بڑی خوبصورت بولتے ہیں۔ ساتھی محبّ اُردو نے کہا۔

ہاں زبان پر رہ جائے گی اردو۔ پرنٹ مر رہا ہے۔ سو دو سو برس بعد لوگ یوں ہی پڑھا کریں گے جیسے آج پالی پڑھتے ہیں یا سنسکرت۔ یکا یک زینت کو بڑی شرم اور خفت کا احساس ہوا۔ سمیرہ اور علی کی روزمرہ کی گفتگو اُردو میں ہی ہوتی تھی۔ رسم الخط سے نابلد تو نہیں تھے لیکن

روانی سے لکھنا پڑھنا بس میں نہیں تھا۔ ادب سے دلچسپی مشاعروں تک محدود تھی۔ سمیرہ مارے باندھے ساس کو اُردو میں خط لکھ لیتی تھیں۔ اب وہ بھی فون پر گفتگو کی وجہ سے بہت کم ہو گیا تھا۔ ٹی۔ وی نے پڑھنے کی عادت کم کرائی اور اب یہ ہر چھوٹے بڑے شہر میں ٹیلی مواصلات کا سلسلہ۔ یہ خط لکھنا چھڑا رہا ہے۔ عائشہ اور فیض ماں باپ سے دو جوتے آگے۔ یہ تو اُردو بولتے بھی بہت کم ہیں۔ چراغ تلے اندھیرا۔ زینت نواسی نواسے کے پیچھے پڑ گئیں۔

''نانی اماں پہلے تو آپ ایسا کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ہندی...... ہمارا مطلب......اُردو بولتے تو ہیں ہم......''

''ذرا زیادہ بولا کرو۔ بلکہ گھر میں انگریزی قطعی بند۔ تم اُردو بولتے ہو یا انگریزی پر نمک مرچ کی طرح چھڑکتے ہو۔''

''نانی اماں آپ کی زندگی کے فنڈے کلیئر نہیں ہیں۔ یہ اچانک اُردو کہاں سے سر پر سوار ہو گئی۔''

''ہاں نانی۔ مگر زبان ہے بڑی فنڈو۔ ہمارے کلاس کے ساتھی اکثر کہتے ہیں اُردو بول کے دکھاؤ۔ قوالی سناؤ۔ غزل سناؤ......'' فیض نے کہا۔

''یہ کیا بکواس ہے۔ فنڈے......فنڈو......زینت ناراض ہو گئیں۔ کہاں سے سیکھتے ہو یہ سب؟''

''ہا ہا ہا...... عائشہ ہنسی۔ یہ تو ایسی ہی بکواس کرتا رہتا ہے۔ اور کرے گا بھی کیا۔ خالی وقت میں یا پکچریں دیکھنا یا بندئیں تڑنا' عقل کہاں سے آئے گی۔۔''

''کیا............؟''

''بندئیں تڑتا رہتا ہے نانی۔ سی۔ پی میں گھوم گھوم کے''

''جیسے تو نہیں جاتی سی۔ پی۔ تو نہیں تڑتی بندے......''

دماغ خراب ہے تم دونوں کا۔ کیا بک رہے ہو۔ زینت واقعی اتنی خفا ہوئیں کہ چہرہ سرخ ہو گیا۔

نانی۔ ہم اُردو بولتے ہیں تو آپ کی سمجھ میں نہیں آتی...... دونوں نے تقریباً کورس میں کہا۔

آج سے تمہاری پڑھائی شروع...... آج تو میں خود بٹھاؤں گی اور پھر جلد ہی ٹیوٹر کا انتظام کراتی ہوں۔اور ہاں...... وہ مُڑیں۔فدا علی کے پاس بیٹھ کر ذرا گپ کیا کرو۔ پھر بولو گے ایسی اُردو جو سب کی سمجھ میں آئے۔

نانی اماں بے چاری۔ سینائل (Senile) ہوتی جا رہی ہیں۔فیض نے عائشہ سے کہا کہتی ہیں فدا علی کے ساتھ گپیں ہانکو۔ ویسے فدا علی ہیں مزے دار۔ قصے خوب سناتے ہیں۔

——دلال پھر سر پر سوار ہو گیا تھا۔

کیا کہتی ہو زینت بیگم۔ دے ہی دیں وہ جالیاں۔ آخر کس کام کی ہیں۔مکان بھی ڈھے رہا ہے اس کا بھی کیا کرنا ہے۔اپنی زندگی میں بیچ باچ کے سب کا حصہ دے ڈالیں تو اچھا رہے گا۔

کتنی بار یہ سوال پوچھیں گے؟ زینت نے رساں سے کہا۔شاید آپ کا ارادہ ہی پختہ نہیں ہے ارادہ پختہ ہو تو سارے کام چٹکیوں میں نبٹ جاتے ہیں۔اب دیکھئے فیض اور عائشہ کے لیے آج تک ٹیوٹر نہیں مل سکا۔چھٹیاں ختم ہونے کو ہیں۔

تفضّل حسین جلدی سے سٹک لیے۔اس ہفتے انہوں نے سودا طے کر ہی لیا۔گاؤں جا کر ٹوٹا پھوٹا بڑا سا مکان جس میں دادا حضور نے سنگ مرمر کی نفیس جالیاں نصب کرائی تھیں، بھی تقریباً بیچ آئے۔ جالیاں تو پہلے ہی نکلوالی تھیں۔تفضّل حسین کے ساتھ فدا علی کا پوتا چلا آیا تھا۔دراصل فدا علی پرانی رعیت میں سے تھے۔اب رعیت نام کی کوئی چیز تو رہ نہیں گئی تہی۔پشتینی تعلقات اور دو چار بیگھہ زمین کے احسانات کی شرم تھی۔

''کیوں میاں پڑھتے ہو؟'' زینت نے شفقت کے ساتھ نادر سے پوچھا

''جی ہاں۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا......''آٹھویں میں ہیں۔''

''کہاں پڑھتے ہو؟''

گاؤں میں مدرسہ ہے نہ؟ مولوی صاحب پڑھاتے ہیں۔ یہ دیکھ لیں؟ اس نے میز پر پڑے اُردو رسالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

زینت خوش ہو گئیں۔آج تک ان کے نواسی نواسوں میں سے کسی کو وہ رسالہ اٹھانے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ ہاں ہاں۔لو...... دیکھ لو......

آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ قدرے توقف کے بعد انھوں نے لڑکے سے پھر پوچھا۔
''میٹرک کریں گے۔ پھر شہر آ کے نوکری ڈھونڈیں گے۔'' اس پندرہ سولہ سالہ لڑکے کی زندگی کے فنڈے بالکل کلیئر تھے۔

میٹرک کے بعد نوکری کہاں ملتی ہے میاں۔

فدا علی کریلوں میں قیمہ بھرنے کے بعد دھاگا لپیٹ رہے تھے۔ بولے۔'' بیگم صاحبہ ابھی لڑکا ہے۔ عقل کہاں سے آئے گی۔ وہ بھی گاؤں کا لڑکا۔ میٹرک کر لے گا تو ہم شہر لے آئیں گے۔ جی، بچ گئے تو اسے آگے پڑھائیں گے۔ بی۔ اے کرے گا تب تو نوکری ملے گی نہ؟ ورنہ یہ بھی ہماری طرح قیمہ بھرے کریلے پکائے گا یا اپنے باپ کی طرح کلکتے میں مزدوری کرے گا۔''

اور بیگم صاحبہ...... انہوں نے آگے کی بات کہی نہیں۔ صرف دل میں سوچی...... اور جو کہیں واقعی ہمارے بھاگ جگے اور ہمارا پوتا شہر میں نوکر ہو گیا تو اس کے بچوں کو ہم شہر کے اچھے اسکول میں پڑھائیں گے۔ واہ میاں فدا علی۔ واہ۔ تم بچو گے یہ سب دیکھنے کو...... ٹھیک ہے نہ بچیں۔ ہمارے خواب ہمارے پوتے کی آنکھوں میں تو ہوں گے۔ ہماری چوتھی پشت تو سدھرے گی۔ یمیرہ بی بی اور علی بھیا کی طرح...... ان کے بچوں کی طرح......

زینت لڑکے سے مسرور لہجے میں کہہ رہی تھیں...... میرے پاس اُردو کی اور بہت سی کتابیں ہیں وہ میں تمہیں دوں گی۔ مبارک ہیں ہمارے گاؤں کے مدرسے جنہوں نے اُردو کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔

کریلوں کو کڑھائی میں جماتے ہوئے فدا علی مستقبل میں ان اسکولوں کے خواب بن رہے تھے جن میں اُردو شاید کبھی نہیں پڑھائی جائے گی۔

آندھیاں ہمیشہ چراغوں کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

☆☆

بی بی کی نیاز

مرزا اسلم بیگ آگے آگے اپنی کھڑ کھڑیا سائیکل پر اور پیچھے پیچھے سفید برقعے میں ملفوف وہ خاتون میاں جان محمد کے رکشے میں ۔ گود میں آٹھ ماہ کا دُبلا پتلا مریل بچہ جو معلوم ہو کہ ابھی پیدا ہوا ہے ۔ وہ بھی قبل از وقت ۔ ایک گوری چٹی تین سالہ بچی بغل میں دُبکی ہوئی ۔ تازہ چھدی ناک میں سیاہ ڈورا ۔ کانوں میں ننھی ننھی چاندی کی بالیاں ۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں ایک صاف چادر میں بندھی چند کپڑوں کی گٹھری

لکھوری اینٹ سے بنے اس جغادری مکان کے نچلے حصے میں صاحب خانہ مرزا نصرت بیگ کا تمباکو کا لمبا چوڑا کارخانہ پھیلا ہوا تھا ۔ اوپر ان کا کنبہ رہتا تھا ۔ اوپر جانے کے لیے گھر کے بغل میں بڑی لمبی اور پتلی راہداری تھی ۔ اس کے اختتام پر ایک گھماؤ تھا اور پھر زینہ ۔ اسلم بیگ نے سائیکل روک دی ۔ رکشے والا بھی رُک گیا ۔ انہوں نے کثیف شیروانی کی جیب سے نکال کر رکشے والے کو پیسے دیے اور بوکھلائی ہوئی خاتون کو راہداری کے دروازے پر لا کھڑا کیا ۔ قدرے توقف کے بعد بولے ۔ ''بی بی میرا کام ختم ۔ اب اوپر جاؤ ۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے ۔ سب تمہارا انتظار ہی کر رہے ہوں گے ۔''

یہ تھا اماں صاحب کا 'ٹیلے پر' کے بڑے مکان میں پہلا داخلہ ۔ اس وقت وہ اماں صاحب نہیں تھیں ۔ دبلی پتلی ، بڑی بڑی روشن آنکھوں ، میانہ قد اور گوری رنگت والی پچیس سالہ خیر النساء بیگم ، دُختر سید امیر علی مرحوم ، زوجہ ذوالفقار علی مرحوم (کہ ذوالفقار علی بھی اٹھائیس برس کی

عمر میں دوسرے بچے کی پیدائش کے مہینے بھر بعد ہی مرحوم و مغفور ہو چکے تھے) تھیں ۔ چوک میں ان کی سسرال والوں کی بساط خانے کی دوکان تھی ۔ شوہر بھی اسی پر بیٹھا کرتے تھے ۔ ان کے مرنے کے بعد خیر النساء بیگم کو ترکے میں کچھ دھنک ، کچھ گوٹا ، چکن کی بیل کے ایک دو تھان ، ایک ڈبہ باریک رنگ برنگے موتی اور ایک جوئیں نکالنے والی لکڑی کی کنگھی حاصل ہوئے ۔ باقی دوکان بڑی نند کے شوہر کے حصے لگی ۔ اس کائنات کو انہوں نے ایک چھوٹی سی ٹین کی صندوقچی میں بند کیا اور سوچنے لگیں کہ باقی زندگی کیسے گذرے گی ۔ پڑھی لکھی تھیں نہیں ۔ میکے میں کوئی سہارا نہیں بچا تھا ۔ اور سسرال میں جدھر آنکھ اٹھاتیں میدانِ کربلا نظر آتا ۔ ایسے آڑے وقت میں مرزا اسلم بیگ کی بیوی فرشتہ رحمت بن کر سامنے آئیں ۔ ان کے ایک دُور کے عزیز نصرت بیگ کے یہاں خیر النساء بیگم کی خدمات کی ضرورت تھی ۔ یہ شریفوں کا کھاتا پیتا گھرانہ تھا ۔ گھر کی بہو کے یہاں جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے لیکن دُودھ خشک ہو گیا تھا ۔

اوپر پہنچ کر خیر النساء بیگم گود کے بچے اور بیٹی کو معہ گٹھری بازوؤں کے گھیرے میں سنبھالے زمین پر بیٹھنے لگیں تو خاتونِ خانہ یعنی مرزا نصرت بیگ کی بیوی نے انہیں ہاتھ پکڑ کر برابر بٹھالیا اور بولیں ...... بی بی ، آلِ رسول ہو کر زمین پر بیٹھو گی تو ہمارے گناہ کیسے بخشے جائیں گے ۔ یہاں بیٹھو ۔ ‘‘ خیر النساء نے چھنگلیا سے آنسو پونچھے ۔ دوپٹے کے کونے میں ناک سڑکی ۔

’’ دیکھو بی بی ۔ ‘‘ خاتونِ خانہ نے ان کی قمیض کی طرف غور سے دیکھا ’’ دو بچوں کو دودھ پلا سکو گی ؟ ‘‘

جی ۔ اسلم چچا نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جڑواں بچے ہیں ۔ سوچ سمجھ کر آئی ہوں ۔ چھدو میاں کو اوپر کے دودھ پر ڈالنا ہوگا ۔

’’ پھر کوئی شکایت نہ ہو ‘‘ خاتونِ خانہ نے ان کی طرف پان بڑھاتے ہوئے کہا ۔

’’ آپ کے یہاں عزت آبرو کے ساتھ میرے معصوم یتیم بچوں کی پرورش ہو جائے گی تو رُواں رُواں احسان مند ہوگا ۔ شکایت کیسی ۔ ‘‘ انہوں نے بڑے عزم کے ساتھ اپنی ستھری آنکھیں اور لانبی پتلی گردن گھما کر ادھیڑ عمر مہربان خاتون کی طرف دیکھا ۔ ’’ ہاں ہماری تین شرطیں ہیں ۔ ‘‘

’’ وہ بھی کہہ ڈالو بی بی ۔ ‘‘

''پہلی بات تو یہ کہ ہم صاحبزادوں کو صرف دودھ پلائیں گے۔ ہم سے گوہ موت کرنے کو نہ کہا جائے۔ دوسری یہ کہ ہم پردہ دار ہیں، گھر سے باہر جانے اور سودا سلف لانے کا کام ہم نہیں کرینگے۔ گھر کے اندر آپ جو چاہیں کرالیں۔ ہمیں سب کام آتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ — ''ان کی گردن تھوڑی اور بلند ہوگئی۔'' ہم پر وقت پڑا ہے تو نکلے ہیں ہماری سات پشتوں میں بھی کسی عورت نے نوکری نہیں کی تھی۔ ہم دائی یا آیا نہیں ہیں ہمارا نام سیدہ خیرالنساء ہے۔''

''بی بی خیرالنساء بیگم۔ خاتونِ خانہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ یہ جو بیٹھی ہیں ہماری بہو، خیر سے ہماری بھتیجی بھی ہوتی ہیں۔ اللہ آمین کر کے شادی کے سات برس بعد ان کی گود ہری ہوئی لیکن دودھ پلانے کی سعادت اللہ کو دینا منظور نہ تھی۔ اب اولاد کی اتنی خدمت بھی نہ کریں گی تو ماں کا درجہ کیسے پائیں گی۔ گوموت ان کے ذمے۔ باقی شرطیں بھی ہمیں منظور ہیں۔ سودا سلف لانے کو ہم یوں بھی نہ کہتے۔ کلاقن عرصے سے کرتی چلی آرہی ہے۔ پھر نیچے کارخانے میں آدمی ہیں۔''

خیرالنساء بیگم کو ان کی کوٹھری دکھادی گئی۔ یہ دراصل ایک اچھا خاصہ بڑا سا کمرہ تھا جو مکان کی پشت پر مکان کے باقی ماندہ حصے سے الگ تھلگ بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گھر کی ملازمہ جو وضع قطع سے بنجر دیہاتی معلوم ہورہی تھی، ان کے لئے کھانے کی سینی لیے ہوئے آئی۔ پراٹھے، کوفتے، ارہر کی دال، باریک سفید چاول، ایک گلاس بالائی دار دودھ اور گود کے بچے کے لیے گائے کا دودھ معہ دودھ کی شیشی کے الگ سے۔ ایسا خوانِ نعمت تو کبھی شوہر کی زندگی میں بھی نہیں سجا تھا۔ لہنگا پھڑکاتی، ناک میں سونے کی چوڑی سی لونگ چمکاتی بلاقن انہیں کینہ تو نظروں سے گھورتی واپس چلی گئی۔'' کہہ رہے تھے ہم اپنی بہن کو لے آویں۔ مگر نہ۔ سیدانی کا دودھ پلاویں گی لڑکوں کو۔ ہونہہ اللہ نے چاہا تو سُوکھا ہو جائے گا۔''

رات کے کھانے پر خاتونِ خانہ نے دن کی پوری داستان صاحبِ خانہ کے گوش گذار کی۔ لہجہ بڑا مسرور تھا۔ آج دونوں ننھے پوتوں نے پیٹ بھر کر عورت کا دودھ پیا تھا۔ اور عورت بھی کیسی کہ کھری سیدانی ورنہ دن بھر ریں ریں کرتے رہتے تھے۔ پانی جیسے دست چلے آتے تھے اور رات کو نیند بھی نہیں آتی تھی۔ اوپر کا دودھ راس نہیں آرہا تھا۔ آج آرام سے سو رہے تھے۔ صاحب خانہ نے کھانا کھا کے ڈکار لی۔ سونے کی خلال سے دانت کریدے اور چاندی کے خاصدان سے گلوری نکالتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں بولے..... ''آپ اماں بیگم کہلاتی ہیں۔

بی بی خیر النساء سے کہہ دیجئے کہ بچے بڑے ہوں گے تو انہیں اماں صاحب کہیں گے۔''

خیر النساء گھر میں یوں رچ بس گئیں جیسے بطخ پانی میں۔ محفوظ مستقبل اور گھر والوں کے اچھے سلوک کی وجہ سے طبیعت مطمئن تھی۔ غذا اچھی مل رہی تھی کہ دودھ اُترے۔ دودھ دھاروں دھار اتر رہا تھا۔ بچہ ایک ہی ہوتا تو چھدّو میاں (جو کان چھید کر منت کا دُر پہنائے جانے کے سبب چھدو کہلاتے تھے) کو بھی بھر پیٹ ماں کا دودھ مل جاتا۔ خیر کوئی فکر نہیں تھی۔ انہیں گائے کا خالص دودھ مل رہا تھا اور وافر مقدار میں مل رہا تھا اس لیے وہ بھی پہلے جیسے سوکھے مارے قحط زدہ نظر نہیں آتے تھے۔ خوب موٹے ہو گئے تھے۔ ہاں دس گیارہ ماہ کے ہو جانے کے باوجود بس پڑے رہتے تھے۔ نہ زیادہ روتے، نہ کچھ بولنے کی کوشش کرتے۔ بغیر سہارے کے بیٹھنا تک شروع نہیں کیا تھا۔ ''غریب کا بچہ ہے اس لیے سمجھ دار ہے۔ روئے دھوئے گا، شرارت کریگا تو ماں دو اور بچوں کو کیسے سنبھالے گی۔'' خیر النساء ہنس کر بڑی مامتا کے ساتھ کہتیں۔

بچوں نے بولنا شروع کیا تو خیر النساء کو اماں صاحب کہلوایا گیا۔ میٹھی توتلی آواز میں جب وہ انہیں اماں صاحب کہتے اور ہمک کر ان کی گود میں آتے تو انہیں لگتا کہ جس دیانت داری کے ساتھ انہوں نے اپنے بچے کو اوپر کا دودھ پلا کر غیر کے بچوں کو اپنے جسم کا لہو دیا تھا اس کا صِلہ مل گیا ہے۔ رفتہ رفتہ سیاہ بالوں اور اُجلے کپڑوں والی خیر النساء سبھی کے لئے اماں صاحب بن گئیں۔

بچے ڈھائی سال کے ہوئے تو دودھ بڑھائی کی رسم بڑی دھوم دھام سے کی گئی۔ تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک دن بُلاقن نے آنکھیں مٹکا کر کہا ''اب کھیر النساء کہاں جئیں؟ نہ ہو تو گونو گھر میں جھاڑو برتن کے لیے رکھوا دیا جائے۔''

خاتونِ خانہ بتھے سے سے اکھڑ گئیں۔ ضرورت ہو تو انسان کو دُوہ لیا جائے اور اس کے بعد ہنکال کر باہر کر دیا جائے۔ خیر النساء یہیں رہیں گی۔ ہاں خود کہیں جانا چاہیں تو اور بات ہے۔ وہ بھلا اور کہاں جاتیں۔ دودھ پلانے کے علاوہ گھر میں بہتیرے کام تھے۔ گھر کی دونوں خواتین کو انہوں نے ساری فکروں سے آزاد کر دیا۔ تیج تہوار، آئے دن کے شادی بیاہ، چھٹی چھلّے، کارخانے کے عملے کا خیال، کپڑے لتّے، باورچی خانہ، دونوں بچوں کی ساری ضروریات، میاں کا حقہ، چھوٹے میاں کے چکن کے کُرتے، ساس کا خضاب، بہو کی مہندی ـــ بیٹی فخر النساء ساتھ ساتھ سائے کی

طرح ساتھ لگی رہتی اور کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ دونوں بچوں نے بھاگنا دوڑنا اور گیند سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے بھی بڑی روانی سے ادا کرنے لگے تھے۔ لیکن ان کا ہم عمر چھدّو ایک گوشے میں بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور باہر کی دنیا کو اپنی وحشت زدہ ویران آنکھوں سے تکتا رہتا۔

کچھ اور وقت گذر جانے کے بعد اماں صاحب کو محسوس ہونے لگا کہ چھدّو نارمل بچہ نہیں ہے۔ اس عمر میں بھی وہ اماں، بڑی بیگم، چھوٹی بیگم جیسے الفاظ کے علاوہ بہت کم الفاظ روانی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ جملوں کی ادائیگی میں اسے دقت ہوتی تھی اور اس کی سمجھ میں بھی کوئی بات جلدی نہیں آتی تھی۔ بڑی بیگم کی تاکید تھی کہ ان کے پوتوں کو جو ماسٹر صاحب پڑھانے آتے ہیں ان کے پاس چھدّو بھی بیٹھے لیکن چند ماہ بعد ماسٹر صاحب نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ یہ لڑکا پڑھ نہیں سکے گا یا کم از کم ابھی تو نہیں پڑھ سکے گا۔ اماں صاحب کی درخواست پر مرزا نصرت بیگ نے چھدو کو ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق چھدو پیدائشی ذہنی ابطا (Mental retardation) میں مبتلا تھا۔ اس میں اصطلاح یا بہتری کی گنجائش تقریباً نہیں کے برابر تھی۔ ہاں مناسب ماحول اور خصوصی تربیت کے ذریعے اسے بالکل ناکارہ بننے سے بچایا جا سکتا تھا۔

بڑے مرزا صاحب نے اماں صاحب کو بُلایا اور شفقت آمیز لہجے میں بولے ''خبر اچھی نہیں ہے۔ کلیجہ مضبوط کر کے سنیئے'' پردے کے پیچھے کھڑی خیر النساء تھر تھر کانپا کیں پھر دھیرے سے بولیں ''اللہ تعالیٰ نے بیٹا دیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ اب ہماری قسمت''۔

''بی بی۔ ہمارے خاندان کے چراغوں کو آپ نے نئی زندگی دی۔ سعید اور وحید نے آپ کا دودھ پیا ہے۔ بڑھاپے کی فکر تو آپ کریں نہیں۔ ہاں عزیزی چھدو کی اس ذہنی حالت کا رنج ہونا فطری ہے۔'' وہ چاندی کی موٹھ والی چھڑی ٹیکتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اماں صاحب اس گھر میں رچ بس کر بیوگی بھول گئی تھیں۔ خوش و خرم رہا کرتی تھیں لیکن اب چور کی طرح دبے پاؤں ایک رنج دل میں آ بسا تھا۔ وہ چھدّو کے چاروں طرف منڈلاتی رہتی تھیں۔ ہر کام سے ذرا سا وقت بچا کر اس کے پاس آ جاتیں۔ رات کو دیر تک اس سے باتیں کرتیں۔ حدیث و قرآن سناتیں۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کا ذہن ان سے روشن ہوگا۔ چھدّو سو جاتا تو بھی وہ جاگتی رہتیں اور اس پر دعائیں دم کرتیں۔ ذہن میں بے چینی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ بڑے

مرزا نے کہہ تو دیا کہ وحید اور سعید ان کے بڑھاپے کا سہارا بنیں گے لیکن چھدّ و خود — ؟ خود وہ اپنے لئے کیا کر سکے گا؟ کیا کبھی اس کا اپنا گھر بار ہو گا؟ کیا کبھی وہ اپنی روزی روٹی کما سکے گا؟ اس کے بڑھاپے کا سہارا کون بنے گا؟ اور اماں صاحب — مانا گھر میں دو روٹیاں مل رہی تھیں اور عزت بھی۔ رہنے کو جگہ بھی ہے۔ لیکن دل کا کشکول تو پھر بھی خالی ہی ہے۔ یہ سوچ کر آئی تھیں کہ پرائی چاکری عارضی بات ہوگی۔ اللہ نے بیٹے سے نوازا ہے۔ ایک دن دوبارہ ان کی اپنی مملکت ہوگی جہاں وہ راج کریں گی۔ ایک جھونپڑا سہی مگر اپنا۔ بیٹے بہو کی ہنسی اور پوتے پوتیوں کی کلکاریوں سے گونجتا۔ وہ سارے خواب مٹی میں مل گئے۔ روز رات کو مٹی ملے یہ خواب بستر پر کانٹے بکھیر جاتے۔ لیکن پھر کسی پہر نیند آ ہی جاتی اور صبح ہونے پر زندگی یوں ہی رواں دواں ہو جاتی۔

چھدو بڑا ہوا تو نیچے جانے لگا۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں پیسے بھی دے دیے جاتے کہ آس پاس کی دوکانوں سے کوئی معمولی سا سودا لے آئے یا ٹھیلے والے سے پھل، سبزی۔ بیگم صاحب کہتی تھیں — پڑھ لکھ نہیں سکتا تو کم از کم دنیا کا علم تو ہونے دو۔ آنچل تلے چھپا کر رکھو گی تو اور باؤلا ہو جائے گا۔ ان کی بات تو صحیح تھی لیکن چھدو نیچے جاتا تو کارخانے کے ملازمین کی تفریح کا سامان بن جاتا...... ابے چھدو ذرا زبان تو دِکھا۔ چھدو بھاڑ سا منھ کھول دیتا اور لوگ ہنستے۔ کوئی کہتا او میاں چھدو پہلے مرغی ہوئی تھی کہ انڈا ذرا بتاؤ تو سہی۔ چھدو پہلے مرغی ہوئی تھی کہ انڈا کی گردان کرتا اوپر پہنچتا اور اماں صاحب کی جان ضیق میں ڈال دیتا ''بتایئے نہ پہلے مرغی ہوئی تھی کہ انڈا۔ ہم کو نیچے جا کر جواب دینا ہے۔'' کبھی کبھی تو چھوٹی بیگم بھی منہ پھیر کر مسکرانے لگتی تھیں۔ ایسے میں اماں صاحب کو بہت تکلیف ہوتی۔

ایک دن چھدو بُلاقن کے ساتھ نیچے اترا تو کسی کارندے کی رگ شرارت پھڑکی۔ اس نے کہہ دیا ''اماں یہ تمہاری جورو ہے۔'' جورو کا لفظ نہ جانے کیوں چھدو کو ایسا بھایا کہ وہ اکثر بُلاقن کی طرف دیکھتا تو کھیسیں نپور کر کہتا جورو۔ چھدو کی جورو۔ ایک دن بھِنّا کر بلاقن نے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ٹھنڈے مزاج والی مسکین اماں صاحب آندھی طوفان بن گئیں۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کوثر و تسنیم سے دُھلی زبان ایسی آگ بھی اُگل سکتی ہے۔ بلقنی ٹھہری گنوار، مغلظات پر اُتر آئی تو خاتونِ خانہ کو دخل انداز ہونا پڑا۔ ''اے ہے بُلاقن، کمبخت، چُپ ہو جا۔ شرم نہیں آتی تجھے۔ دُکھیا باؤلا ہے۔ اسے اتنی عقل کہاں۔ کسی نے سکھا دیا ہوگا۔ بے سوچے سمجھے طوطے کی طرح بولتا رہتا ہے۔''

"دُکھیا باؤلا ہے" یہ الفاظ اماں صاحب کے دل میں ترازو ہو گئے۔ بُلاقن جیسی گنوار، بدزبان، نمک حرام عورت ذی ہوش ہے اور ان کا کم سخن نیک بیٹا باؤلا۔ اس دن انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔ رات میں چھدو کو گلے لگا کر خوب روئیں۔

پھر اتنا زمانہ گذر گیا کہ اماں صاحب پر یہ خطاب پھبنے لگا۔ افسردہ خاطر اور ملول رہا کرتی تھیں۔ اس لئے چہرے پر بڑھاپا جلد ہی آ گیا۔ بال بھی وقت سے کچھ پہلے کھچڑی ہو گئے۔ خاتونِ خانہ اور صاحبِ خانہ دونوں جنّت سدھارے۔ ان کی جگہ بیٹے بہو نے لی۔ سعید اور وحید جوان ہو گئے۔ اماں صاحب کی بیٹی رابعہ کی شادی بڑے مرزا صاحب نے اپنی زندگی میں ہی دیہات کے ایک غریب لیکن شریف نوجوان سے کرادی تھی۔ سعید میاں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گئے تو وہیں رہ پڑے۔ شادی بھی اپنی مرضی سے کر لی۔ اس لیے وحید میاں کی شادی میں ان کے والدین نے سارے ارمان پورے کئے۔ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی تب لڑکی پسند آئی۔ چنبیلی جیسی نرم و نازک اور سفید، نازوں کی پالی۔ سسرال میں پھول دلہن خطاب ملا۔

گھونگھٹ الٹا تو پھول دلہن کو معلوم ہُوا کہ اماں صاحب دُولہا میاں کی کِھلائی رہ چکی ہیں، کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہیں۔ انہوں نے ان کو اماں صاحب کہنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہا اماں صاحب تو ہم اپنی نانی محترمہ کو کہتے ہیں کہاں وہ اور کہاں یہ کھلائی۔ نیا نیا معاملہ۔ ساس تو کچھ بول نہ سکیں۔ وحید میاں نے سمجھایا تو اماں کہنے پر راضی ہوئیں۔ وہ بھی بادلِ نخواستہ۔

گھر میں دُلہن بیگم کا عمل دخل بڑھا تو چھدو میاں کے اندر آنے پر پابندی لگادی گئی۔

"مُوا خبطی — صبح صبح شکل دیکھ لو تو نا کھانہ ملے۔" ان کا تبصرہ تھا۔

"ایسے نہ کہو پھول دُلہن۔ سیدزادہ ہے بدنصیب۔"

"اجی بہت دیکھے ہیں ایسے بنا سپتی سید۔ کس سن میں سیّد ہوئے تھے؟"

بُلقنی کھلکھلا کر ہنسی۔ گھر کی پُرانی منہ لگی ملازمہ تھی۔ بولی۔ اجی دُلہن بنا سپتی ہوں یا رنخالص۔ رشتے میں تمہارے دیور ہوتے ہیں۔ میاں نے ان کا جھوٹا دُودھ پیا ہے۔ پھر وہ گانے لگی'

سُنو ہو دیورا آ رج ہمار (دیور جی میری عرض سنو)

دُور کمبخت دیور ہوگا تیرا۔ خدانخواستہ شیطان سے دُور میرے دیور کیوں دیوانے ہونے لگے۔ اب سے بولی ہے تو مارے چپلوں کے فرش کر دوں گی مُردار۔ بُلقنی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شیطنت

سے ٹھی ٹھی کرتی رہی۔اماں صاحب کے کلیجے میں چھلنی جیسے سُوراخ بنتے چلے گئے۔

دُلہن بیگم کو اس دن سے چھدو سے خدا واسطے کا بیر ہوگیا۔صورت سے بد کنے لگیں۔دیور والے رشتے کی طرف ان کا دھیان پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔عمر گذرنے کے ساتھ ساتھ چھدو زیادہ ہونق ہوگیا تھا۔کچھ تو قدرت نے اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی کچھ حالات کی بے رحمی۔باوجود اس کے کہ چھوٹے مرزا صاحب اماں صاحب کو گاہے بگاہے معقول رقم دے دیا کرتے تھے اور کپڑوں کی کمی نہیں تھی لیکن چھدو اب صرف ایک جانگیے اور بنیان میں ملبوس رہا کرتا تھا۔کبھی اماں صاحب کُرتا پہننے پر اصرار کرتیں تو ضِد میں بنیان بھی پھاڑ دیتا۔گردن پر میل کی تہیں بوائی پھٹے ننگے پیر۔اکڑوں بیٹھا انگلیوں پر کچھ گِنا کرتا۔کارخانے کے کارکن کہتے چھدو پر جن آتے ہیں۔اور وہ اسکو معمول بنا کر پریاں بُلاتے رہتے ہیں۔ریشم میں لپٹی،پھولوں اور عطر میں بسی نئی دُلہن کی نظر اس پر پڑتی تو چیں بہ جبیں ہو جاتیں۔ایک دن وہ ان کے ذاتی کمرے میں گھُس گیا تو انگارہ ہی تو بن گئیں جُوتی اُٹھا کر اس کے منہ پر پھینکی۔

اماں صاحب کی خاصی کوششیں اب چھدو کو پھول دُلہن کی نظروں سے دُور رکھنے میں صرف ہونے لگیں۔اس کو زنان خانے میں دیکھتے ہی چیل کی طرح دوڑتیں اور بہلا پھُسلا کر واپس اپنے کمرے میں چھوڑ آتیں۔

وقت کا ایک اور ریلا گذر گیا۔پھول دُلہن اوپر تلے چار بچوں کی ماں بنیں۔بچے بڑے ہونے لگے۔ساری زچکیاں جاپے اماں صاحب نے ہی نمٹائے۔ہر بچے کی پیدائش پر یوں نہال ہوئیں جیسے ان کے اپنے بیٹے کے یہاں اولاد ہوئی ہو۔وحید میاں کا بچپن یاد آجاتا۔ان کا ہُمک کر گود میں آنا،چھاتی سے چپک کر دُودھ پینا،ماں کے ڈانٹنے پر بھاگ کر''اماں چھاب'' کی گود میں دُبک جانا۔رضاعی رشتوں کا تو خود اللہ اور اس کے رسولؐ نے بڑا مان رکھا ہے۔پھول دُلہن اس رشتے سے کیسے انکار کرسکتی تھیں کہ ان کے دُولہا اماں صاحب کے رضاعی بیٹے تھے۔اماں صاحب نے اب گو موت والی شرط بُھلا دی۔بھلا اصل سے سود پیارا ہوتا ہے یا نہیں۔ایک دن بچوں کے لیے کچھ ضرورت پڑی تو سر پر برقعہ ڈال کر بازار بھی نکل گئیں۔سوچا وہ تو جوان بیوہ کا بھرم رکھنے والی شرط تھی۔اب کیا۔اب تو سر چٹا ہوگیا۔بیٹی کا سسرال سے خط آیا ہے۔اس کی بیٹی جوان ہورہی ہے۔لکھا ہے رشتے کی تلاش ہے۔نانی بن چکیں۔پرنانی بننے میں کیا دیر لگے گی۔

پھر اماں صاحب باقاعدہ سودا سلف کرنے لگیں۔ ایک بار کیا نکلیں کہ پھول دُلہن نے انہیں برابر بھیجنا شروع کر دیا۔ انہیں اماں صاحب کی ایمانداری پر دوسروں سے زیادہ بھروسہ تھا۔ اماں صاحب ایک دن بازار سے لوٹ رہی تھیں کہ ان کی نظر چھدو پر پڑی۔ گھر کے قریب عالم نگر کی چڑھائی پر کچھ ٹٹ پونجیا طوائفیں رہا کرتی تھیں اور کچھ ہجڑے۔ وہ وہیں ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ ایک ہجڑا اس کے ساتھ کچھ فحش مذاق کر رہا تھا۔ دو تین بھدّی صورتوں اور بے ہنگم جسموں والی طوائفیں ٹھی ٹھی ٹھی کر کے ہنس رہی تھیں۔ اماں صاحب کو جیسے لرزہ چڑھ گیا۔ سر نیہوڑائے جلدی جلدی لاحول پڑھتی وہاں سے نکل آئیں اور گھر آتے ہی ایک ایک کی خوشامد شروع کی۔ خدا کا واسطہ کسی کو بھیج کر چھدو کو بلوا لو۔ ارے بلاقن تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تجھے علی کا واسطہ...... بچوں کی قسم...... اماں صاحب کا بلبلانا دیکھ کر بلاقن کو ترس آ گیا۔ لیکن کہنے لگی کہیں اور ہوتا تو بلا لاتی، وہاں کون جائے شہدوں اور کسبیوں میں۔

چھدو گھر واپس آیا تو اڑتیس برس کی عمر میں اس نے پہلی بار اماں صاحب سے ڈانٹ سُنی۔ وہ بھی ایسی کہ اس کے حواس گُم ہو گئے۔ ابھی وہ گرج ہی رہی تھیں کہ وحید میاں کے چھوٹے بیٹے نے کہا چھدو، نیچے چاٹ والا آیا ہے۔ جاؤ دوڑ کے لے آؤ۔ وہ بوکھلا کے بھاگا۔ چاٹ لانے میں اسے اپنی عافیت بھی نظر آئی۔ ویسے بھی ذرا ذرا سے کاموں کے لیے اوپر نیچے بھاگنے کا عادی تھا۔ اماں صاحب کی سانس پھولنے لگی انہوں نے چاول کی سینی سامنے سرکائی اور چاول چننے شروع کر دیے۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتی جاتی تھیں۔

''ارے چھدّو۔ اس میں مرچیں زیادہ ڈال دی ہیں چاٹ والے نے۔ جاؤ دہی اور ڈلوا لاؤ......''

بڑے صاحبزادے بھی آ گئے تھے۔ چھدّو ــــ ابے او احمق الذّی...... مجھے بھی چاٹ کھانی ہے۔ جاؤ ایک پتہ اور بنوا لاؤ۔'' چھدو نے حکم کی تعمیل کی۔

''ابے میرے لیے مرچیں کم کیوں ڈلوائیں۔ میں تھوڑی ہی مرچیں کم کھاتا ہوں۔ اب جاؤ اور مرچیں اور کھٹی چٹنی ڈلوا کے لاؤ۔''

بڑے مرزا اور چھوٹے مرزا چھدو کا ذکر عزیزی چھدّو کہہ کر کرتے تھے۔ وحید میاں جنہوں نے اماں صاحب کا دُودھ پیا تھا، چھدّو میاں یا بھائی چھدّو کہتے تھے۔ لہجے میں ہمدردی اور یگانگت کی چاشنی ہوتی تھی۔ لیکن ان کی اولادیں ابے تبے کرتی رہتی تھیں۔ یہ لوگ اور چھوٹے تھے تو

چھدو ہر وقت گھوڑا بنا رہتا تھا اور وہ سارے بچے اس کی پشت پر سوار رہتے تھے۔ لیکن کیا بڑے ہو کر بھی انہوں نے چھدو کے منہ سے لگامیں ہٹائی تھیں؟ آنسوؤں سے لبالب آنکھیں اماں صاحب نے اوپر اٹھائیں۔ عین اسی وقت چھدو ہاتھ میں چاٹ کا بھرا پتہ لے کر زینے تک پہنچا تھا۔ وہ آنسو بھری دھندلی آنکھیں جن میں صدیوں کا درد تھا، اُس کی بیل جیسی۔ بڑی لیکن تاثر سے خالی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ چھدو بوکھلا کر اڑا اڑا دھم کر کے پہلی سیڑھی سے جو گرا تو سیدھے نیچے راہ داری میں پہنچ گیا۔ ساری چاٹ آنکھوں اور حلق میں بھر گئی۔

پگلا کہیں کا۔ ساری چاٹ گرا دی۔

ارے میرا چھدو۔ میرا بدنصیب چھدو۔ اماں صاحب دیوانہ وار چیخیں اور دوڑتی ہوئی نیچے اتریں۔

سر کا زخم بھرنے میں مہینوں لگ گئے۔ مگر بھر گیا۔ اماں صاحب کے دل میں جو زخم آیا تھا وہ کبھی نہیں بھرا۔ ہمیشہ افسوس کرتی رہیں۔ میری وجہ سے گرا میرا چھدو۔ میں نے کبھی اسے ڈانٹا نہیں تھا۔ اس دن ڈانٹ کھانے سے بوکھلا گیا تھا۔

اماں صاحب اب دن میں ایک آدھ چکر عالم نگر کی چڑھائی کا لگا آتیں کہ چھدو وہاں کہیں پھر تو نہیں پہنچ گیا۔ جب تک گھر نہ آجاتا جلے پیر کی بلی کی طرح گھومتی رہتیں۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھ رہی تھی وہ اپنا زیادہ وقت باہر گذار رہا تھا۔ اس کی کھانے کی مقدار بھی گھٹتی جا رہی تھی۔ اکثر اماں صاحب، نوالے بنا کر منہ میں دیتیں۔ خوشامدیں کر کر کے کھلاتیں۔ نل پر بٹھا کر رگڑ رگڑ کر نہلاتیں۔ چھدو اپنے بچپن میں لوٹ رہا تھا۔۔۔۔۔۔

انہیں دنوں سعید میاں نے والدین کے لئے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھیجے۔ وہ دونوں میاں بیوی ولایت سدھارے۔ پھول دلہن کے میکے میں کوئی شادی تھی۔ سارا گھر اماں صاحب اور رُلا قن پر چھوڑ کر وہ بچوں اور وحید میاں سمیت بریلی چلی گئیں۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ مہاوٹیں جھما جھم برس رہی تھیں۔ آسمان ہاتھی جیسے سیاہ مہیب بادلوں سے بھرا پڑا تھا۔ چھدو گھر سے غائب ہوا تو تین دن گذر گئے اور اس کی صورت نہیں دکھائی دی۔ گھر سے باہر بھوکا نکل گیا تھا اور روئی کی مرزئی بھی اُتار گیا تھا۔ اماں صاحب کے منہ میں بھی کھیل اُڑ کر نہیں گئی۔ چوتھے دن کارخانے کے ایک آدمی نے خبر دی کہ چھدو واپس آگیا ہے۔ مگر پڑوس کی مسجد میں بیٹھا ہوا ہے۔ اماں صاحب بھیگتی ہوئی خود

وہاں گئیں۔ لیکن اس نے لال لال آنکھیں نکال کر انہیں گھورا اور گھر آنے سے صاف انکار کردیا۔ بخار میں تپ رہا تھا۔ اماں صاحب روئیں گڑگڑائیں تو دو چار لوگ اور گئے اور زبردستی ڈنڈا ڈولی کر کے گھر واپس لائے دو دن کے شدید بخار اور ہذیانی کیفیت کے دوران سید نذر عباس حیدر عرف چھدو میاں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ کارخانے کے لوگوں نے آخری منزل پہنچایا۔ اماں صاحب بُت بنی بیٹھی رہیں۔ نہ روئیں نہ چلائیں۔ جنازہ اٹھنے لگا تو پاس جاکر سر پر ہاتھ رکھا پیشانی چُومی اور بھاری آواز میں بولیں۔ جا بیٹا، جا۔ پیچھے سے آتی ہوں۔ دیر نہیں کروں گی۔

چوتھے دن وحید میاں کُنبے کے ساتھ واپس لوٹے۔ خبر سُن کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ اماں صاحب کی کوٹھری میں گئے۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کہیں کیا نہ کہیں۔

"اماں صاحب۔"

"ہاں بیٹا۔"

"بہت افسوس ہوا۔" وحید میاں اتنا ہی کہہ سکے۔ آواز رُندھ گئی۔

"افسوس کیسا بیٹا۔ میں نے تو بی بی کی نیاز مانی تھی۔ اب تم آگئے ہو تو دُلہن سے کہوں گی کروادیں۔ پیسے میرے پاس ہیں۔

وحید میاں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا تو جلدی سے بولیں۔ نا بیٹا نا' منت کی نیاز، مجلس، میلاد پرائے پیسوں سے نہیں کرتے۔ یہ میری کمائی کے پیسے ہیں۔ منت میں نے مانی تھی۔

وحید میاں ہونقوں کی طرح اماں صاحب کو دیکھنے لگے جو ٹین کی صندوقچی میں روپے ٹٹول رہی تھیں۔

"ہاں بیٹا۔ کبھی منت مانی تھی کہ بدنصیب کی مٹی منزل میرے سامنے ہو جائے تو حضرت بی بی کی نیاز دلواؤں گی۔" ان کا لہجہ انتہائی پرسکون تھا۔ ستھری آنکھیں براہ راست وحید میاں کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

پڑوس کی مسجد سے جہاں چند دن پہلے بخار میں تپتا چھدو نہ جانے کہاں سے آکر بیٹھ گیا تھا، مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ شام کے سائے بلند ہوئے اور بسیرا لیتی چڑیوں کی آوازیں بھی۔

وحید میاں پتے کی طرح تھر تھر کانپنے لگے۔

☆☆

حصار

شوکت کے کمرے سے آتی ہوئی تیز موسیقی اسی وقت مسز فرح احمد کے کانوں سے ٹکرانے لگی تھی جب اسٹاف کاران کے بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوئیں تو موسیقی کے ساتھ قہقہوں کا طوفان بھی کانوں پر حملہ آور ہوا۔ وہ ہلکے سے مسکرائیں۔ شوکت کے کمرے کے سامنے سے گذرتے ہوئے انہوں نے ایک چور نظر اندر ڈالی۔ چار پانچ لڑکے تھے اور تین لڑکیاں۔ ایک سفید فام لڑکی انداز سے امریکن معلوم ہوئی۔ وہ آگے بڑھ گئیں لیکن شوکت نے انہیں پکار لیا۔ ممی۔ ممی، ادھر آیئے۔

وہ شوکت کے دوستوں کے درمیان دخل انداز ہونا پسند نہیں کرتی تھیں لیکن خود اس نے انہیں آواز دی تھی اس لئے وہ اندر آ گئیں۔ سارے چہرے جانے پہچانے تھے۔ عمران، رتن، سیما، عذرا، چوپڑہ۔ شوکت کو صرف اس غیر ملکی لڑکی کا تعارف کرانا تھا...... ''یہ سارا ہے ممی، سارا ڈین۔ حال ہی میں اسٹوڈنٹس ایکسچینج پروگرام کے تحت ہندوستان آئی ہے۔'' لڑکی بہت حیرت سے فرح کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی ''یہ سچ مچ تمہاری ماں ہیں؟ ہرگز نہیں یہ تو تمہاری بہن معلوم ہوتی ہیں......''

اور وہ بھی چھوٹی ...... عمران نے لقمہ دیا۔

فرح احمد کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ واقعی وہ اونچے قد کی صحت مند لڑکی جو شوکت کی ہی ہم عمر ہوگی یہی کوئی اٹھارہ انیس برس کی ، ان کے اوپر کسی چھتنار درخت کی طرح سایہ فگن تھی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لئے انہیں سر اٹھانا پڑا۔ شوکت بڑی بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا ممی تو بالکل گڑیا ہیں ...... ہیں نا؟

''ہاں ۔ بہت ہی خوبصورت گڑیا۔'' لڑکی کی لہجہ سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ امریکن نہیں انگریز تھی۔

ان لوگوں سے رسمی باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑیں۔ چلتے چلتے انہوں نے کہا چائے بھجواؤں ......؟

نہیں ماں۔ چائے پی لی۔ ہم لوگوں نے خود بنائی تھی اور سارہ نے اسپینش آملیٹ تیار کیا تھا۔

شوکت نے کہا۔

''آنٹی۔ فریج کے سارے انڈے ختم۔ پورے ڈیڑھ درجن تھے۔'' چوپڑہ نے ہانگ لگائی۔

''اور مکھن بھی ......'' یہ سیما تھی۔

اور ساری سبزیاں ،تتن پچی چر گیا۔ عذرا زور سے چلائی اور وہ سب ہو ہو کر کے ہنس پڑے۔ آسو بوا نے چائے کی کشتی ان کے بیڈ روم میں پہنچا دی تھی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئیں اور چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ باہر ہوا خنک اور خوشگوار تھی۔ گل مہر کے پھولوں کا موسم ختم ہو چکا تھا اور پیڑ باریک سبز پتوں سے لدے جھوم رہے تھے۔ شوکت کے کمرے سے آتی چیختی چلاتی ہوئی موسیقی کا شور اور اس کے دوستوں کے قہقہے یہاں تک پہنچتے پہنچتے مدھم سے ہو گئے تھے۔ بڑا سا بنگلہ پڑا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دل کسی گدا

گر کے کشکول کی طرح خالی تھا۔ دل ہی کیوں یہ سارا ماحول، یہ سب کچھ ......انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

آسو بوا ٹرے واپس لینے کو آئی تھیں۔ ان کا پندرہ سالہ نواسہ جو اوپر کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا، ان کے پیچھے کھڑا تھا۔

کیا ہے امجد......؟ انہوں نے ادھ کھلی آنکھوں کے نیچے سے اسے دیکھ کر کہا۔

بھیا نے کہلوایا ہے کہ رات کا کھانا گھر پر نہیں کھائیں گے۔ وہ جو آئی ہیں نا............وہ ولایتی بٹیا ان کی............کیا کہتے ہیں کہ ان کی سالگرہ ہے۔

فرح نے طویل سانس لی۔ آج صبح ناشتے پر بھی شوکت ساتھ نہیں تھا۔ وہ اکیلے ہی تھوڑا بہت کھا کر روانہ ہو گئی تھیں۔ شوکت کو سویرے ہی لائبریری جانا تھا اور اس نے بوا کو بھی نہیں جگایا تھا۔ خود ہی فریج سے کچھ نکال کر کھا لیا تھا اور خود ہی کافی بنالی تھی۔ وہ مسکرا پڑیں۔ شوکت بہت محنتی تھا اور بہت ذہین بھی۔ بلا کا کھلنڈرا اور یار باش لیکن تعلیم کے معاملے میں اتنا ہی سنجیدہ.........سارے ذہنی خواص بھی بالکل باپ کی کاربن کاپی تھے۔ باہر لان میں کچھ نقرئی قہقہے چھلکے۔ فرح نے سامنے دیکھا تو شوکت کھڑا کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔

امجد نے کہہ دیا نا کہ ہم لوگ کھانا باہر ہی کھائیں گے......؟

ہاں شوکی مگر دیر مت کرنا۔ فکر ہو جاتی ہے۔

شوکت جھنجھلا گیا۔ ممی میں کوئی ننھا بچہ ہوں کیا؟ ڈنر پر جا رہا ہوں۔ دیر تو ہو ہی جائے گی۔ او کے ماں۔ بائی بائی۔ اس نے کسی قدر رکھائی سے کہا اور ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ پیچھے سے اس کے لانبے چوڑے فریم کو دیکھتی رہ گئیں۔ یہ شوکی تھا ان کا ننھا شوکی۔ اب تو اس کے چکنے گورے گالوں پر داڑھی مونچھوں کی کھردراہٹ اور نیلا پن دور سے

دکھائی دینے لگے تھے۔ اب بھی کلیجے میں ہوک اٹھتی تو اس کو سینے سے بھینچ کر اس کے نرم گالوں پر چہرہ رکھ کر اس کے نازک ہونٹوں پر پیشانی لگا کر کلیجے میں ٹھنڈک ڈالنے کا تصور بڑا مضحکہ خیز لگتا تھا۔ خالی وقت میں اس کے ننھے ننھے کپڑے خود سینے، اس کے سامان پر بچوں والے گل بوٹے اور چوہے بلی کی تصویریں پینٹ کرنے، اس کے پیچھے کھانے کی پلیٹ لے کر سارے گھر میں گھومنے جیسے فضول لیکن دلچسپ کام اب نہیں تھے۔ آفس سے آنے پر کوئی بچہ آیا کی گود چھوڑ کر ان کی طرف نہیں لپکتا تھا۔ پندرہ سال پہلے جب ان کے ورزشی جسم اور لانبے قد والے ۲۸ سالہ نوجوان شوہر سلیم احمد ایک حادثے کا شکار ہوئے تھے تو شوکت اس وقت محض تین برس کا تھا اور فرح اس سے یوں چمٹ گئی تھیں جیسے ڈوبی ہوئی کشتی کا بچ جانے والا مسافر پانی میں بہتے کسی بوسیدہ سے تختے، گھاس کے گچھے یا ایسی ہی کسی بے مصرف چیز کو اُمید کی آخری سیڑھی سمجھ کر اس سے چمٹ جاتا ہے...... اور پھر پندرہ برس انہوں نے یونہی گذار دیئے۔ رات کو تنہائی کا احساس ڈستا تو وہ پاس سوئے ہوئے شوکت کو خود سے اور بھی قریب کر لیتی تھیں۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو سینے پر رکھ لیتیں اور انہیں نیند آ جاتی۔ پھر شوکت بڑا ہونا شروع ہوا تو پہلے اس کا بیڈ علیحدہ کرنا پڑا، پھر کمرہ۔

اب کچھ برسوں سے تو وہ مزید خود مختار ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں کا اپنا الگ حلقہ تھا۔ کالج اور کتابوں کے علاوہ بھی اس کے کچھ شوق تھے۔ وہ فرح سے بہت محبت کرتا تھا لیکن ماں دوستوں کا اور باہر کی دنیا کی رنگا رنگ مصروفیتوں کا نعم البدل کبھی نہیں بن سکتی۔ کسی کے لیے بھی نہیں چہ جائیکہ ایک خوش حال خوش باش نوعمر لڑکے کے لیے، دنیا جس کے قدموں میں ہوتی ہے اور زندگی جس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔

'میں تعلیم یافتہ ہوں اور میرا شمار ان بوڑھوں میں نہیں ہے جو

نوجوانوں کی ضروریات سے آنکھیں چراتے ہیں کہ ان کا اپنا زمانہ بہت مختلف رہا ہوتا ہے......'' فرح نے سوچا تھا اور شوکت کی ذاتی مصروفیات کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا تھا۔ تنہائی کے ناگ نے اتنے دھیرے دھیرے پھن اٹھانا شروع کیا تھا کہ ابتدا میں وہ سمجھ ہی نہیں سکی تھیں کہ ان کی اپنی دنیا میں کوئی تبدیلی بھی آ رہی ہے۔ لیکن اب ناگ اپنی دم پر کھڑا ہو چکا تھا اور اس کے پھن سے زہر ٹپک رہا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر احسن کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔

احسن فیاض اسی ہوٹل کی انتظامیہ میں تھے جہاں فرح انٹریئر ڈیکوریشن کا شعبہ سنبھالے ہوئے تھیں وہ عرصے سے بیوی سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ چند برس پہلے ان کی بیوی نے باقاعدہ طلاق لے لی تھی اور اپنے آٹھ سالہ بچے کو لے کر کناڈا چلی گئی تھی جہاں اس کا محبوب منتظر تھا۔ اوپر سے خوش و خرم نظر آنے والے بذلہ سنج، خوش مزاج احسن اندر سے ٹوٹے ہوئے انسان تھے۔ فرح نے جب سے ان کو قریب سے جانا وہ سلیم کو زیادہ یاد کرنے لگی تھیں۔ سلیم اگر زندہ ہوتے تو اسی عمر کے ہوتے۔ ان میں بھی ایسی ہی خوش مزاجی تھی اور ایسی ہی وضع داری۔ محبت کرنے کی ایسی ہی صلاحیت۔ ان کی پرچھائیں جو وقت کی دھند میں دھیرے دھیرے مدغم ہو رہی تھی، پھر اجاگر ہو اٹھی تھی جیسے ان کے بنگلے کے پیچھے بنی ہوئی ٹیلے والی مسجد کا سلہوٹ جو ڈوبتے سورج کی روشنی کے چند مخصوص لمحات میں اچانک اجاگر ہو اٹھتا تھا۔

......وہ سب جا چکے تھے اور سناٹا بڑھ گیا تھا۔ فرح نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی صرف سات بجے تھے۔ شام اور رات کے درمیان کا یہ وقفہ سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا تھا۔ انہوں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ احسن کو رنگ کریں کیا......؟ نہیں اتنی بے صبری ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ کل وہ یہاں آئیں گے۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ

دونوں اپنے درمیان ایک باہمی کشش کا اعتراف کر چکے تھے۔ ان کی رسمی گفتگو غیر رسمی بن چکی تھی۔ تنہائی میں وہ انہیں مسز احمد کی بجائے فرح کہتے تھے۔ اکثر گھر پر فون کر لیتے تھے۔ چھٹیوں میں ملنے چلے آتے تھے۔ دو تین مرتبہ انہوں نے کھانا ساتھ ہی باہر کہیں کھایا تھا۔ کسی شناسا کے ذریعے دیکھ لئے جانے اور تنقید کا نشانہ بننے کے خوف کو ان دونوں نے قطعی نظر انداز کیا تھا۔ ویسے بھی فرح اپنی پروقار، خوبصورت شخصیت اور صلاحیتوں کی وجہ سے اتنی مقبول تھیں کہ ان کی خوشی میں خوش ہونے والے زیادہ تھے اور ایسا ویسا سوچنے والے کم۔

ایسا ویسا سوچنے والے کم...... فرح کے ذہن میں اچانک شوکت گردش کرنے لگا۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ شوکت اِدھر کچھ گستاخ اور بے ادب ہوتا جارہا ہے۔ وہ احسن کے آنے کو ناپسند کرتا ہے۔ حالانکہ تعلقات کے اس نئے موڑ سے پہلے بھی وہ ایک آدھ مرتبہ ان کے گھر آئے تھے اور سلیم کی انشورنس پالیسی کے سلسلے میں بہت مدد کی تھی۔

انتظار...... انتظار...... انتظار۔ فرح نے تھکے تھکے ذہن کے ساتھ سوچا۔ اس مناسب موقعے کا انتظار کرنا ہوگا تاکہ وہ شوکت کو بتاسکیں کہ وہ اپنی زندگی کے متعلق ایک اہم فیصلہ کرنے والی ہیں۔ شوکت ننھا بچہ نہیں ہے۔ خود کو بڑوں کی صف میں شمار کرنے پر مصر جوان ہوتے ہوئے لڑکے کے ردِ عمل کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اب وہ کسی اجنبی کو باپ کا درجہ دینے کو تیار ہوگا یا نہیں؟ اگر نہیں تو؟ فرح کا ذہن اس مسئلہ کا حل نکالنے سے قاصر تھا۔ سلیم کے انتقال کے چند ماہ بعد جب پاپا زندہ تھے تو انہوں نے کتنی کوشش کی تھی کہ فرح کی دوسری شادی کر دیں لیکن اس وقت انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ کفالت ان کے لیے مسئلہ نہیں تھی سلیم نے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ پھر شادی کے بعد فرح نے اپنے محبوب مضمون یعنی

انٹیریر ڈیکوریشن کا کورس جاری رکھا تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے منسلک ہوگئی تھیں اس وقت ان کا سارا دھیان شوکت پر مرکوز تھا۔ وہ اس کے لیے کوئی جذباتی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ شادی کر لیتیں تو شوکت کی پسند ناپسند مسئلہ نہ بنتی۔ کیا وہ فیصلہ غلط تھا؟ تنہائی کے لمحات اکثر اس کا حساب بھی مانگا کرتے تھے۔

—— چائے میں دودھ ملانے کے بعد شوکت نے دودھ دان اتنی زور سے ڈائننگ ٹیبل پر رکھا کہ وہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ یہ ٹی سیٹ فرح کو بہت عزیز تھا اور اسے وہ خاص خاص موقعوں پر ہی نکالتی تھیں۔ ''شوکت۔'' وہ ذرا درشت لہجے میں بولیں۔ لیکن شوکت نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور چائے کا کپ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کسی اندرونی جھنجھلاہٹ کا مظہر تھے۔ ابھی ابھی ڈرائنگ روم سے احسن فیاض اٹھ کر گئے تھے۔ وہ ان کے سامنے گھر میں داخل ہوا تھا۔ جس انداز میں اس نے انہیں سلام کیا تھا وہ بالکل ایسا تھا جیسے کوئی ناک پر بیٹھی مکھی اڑا رہا ہو۔ ان کے جانے کے بعد ہی وہ کہیں سے دوبارہ نمودار ہوا تھا اور آندھی طوفان کی طرح اپنی چائے خود بنا کر پیالہ ہاتھ میں لئے غائب ہوگیا تھا۔ فرح کا دل حلق میں آرہا۔ وہ پچھلے دروازے سے ہوتی ہوئی مکان کی پشت تک پہنچیں۔ پیچھے سبزیوں کا چھوٹا سا قطعہ تھا اور رات کی رانی کے دو پودے سہارا پا کر اوپر اوپر پھیل گئے تھے۔ شوکت آرام کرسی وہیں لے آیا تھا اور اب اس میں پڑا ہوا پولٹیکل سائنس کی کسی موٹی سی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

شوکی.......... وہ کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئیں۔

شوکت نے ان کی طرف دیکھا۔ کتاب ہاتھ سے رکھی پھر اچانک بغیر کسی تمہید کے بولا۔

ممی.......... آپ شلوار کرتا کیوں پہنتی ہیں؟

وہ بہت زور سے چونکیں۔شوکت نے ان کے پہننے اوڑھنے کے معاملے میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔اس کا خیال تھا ممی بہت ہی خوش پوش، جامہ زیب اور باذوق خاتون ہیں۔ خود شوکت جو رنگ برنگے ''یونی سیکس'' لباس پہنا کرتا تھا وہ انہیں پسند نہیں تھے۔ خاص طور سے چاندی کی وہ موٹی سی زنجیر جو اس نے گلے میں لٹکا رکھی تھی۔لیکن وہ جوان ہوتے ہوئے بچوں پر زیادہ پابندیاں لگانے کی قائل نہیں تھیں۔ان کے منہ کا مزا تلخ ہوا تھا۔

میں کیا پہنتی ہوں کیا نہیں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔میرے لباس کبھی حیا اور وقار کی حدود سے آگے نہیں بڑھے۔ انہوں نے ذرا درشت لہجے میں کہا۔

''ماں۔آپ صرف ساڑی پہنا کیجئے اور ڈھیلا سا جوڑا بنایا کیجئے۔ باقی اسٹائل اب آپ کو زیب نہیں دیتے۔'' شوکت نے ان کے لہجے کی درشتگی کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔

تم ہوش میں تو ہو۔فرح اب واضح طور پر چڑ گئی تھیں۔شوکت نے کوئی جواب نہیں دیا۔لیکن اس کا منہ پھیر لینے اور خاموش رہ جانے کا انداز انتہائی گستاخانہ اور تکلیف دہ تھا۔فرح کو محسوس ہوا کہ سلیم زندہ ہو اٹھے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی تھے۔ محبت کرنے والے لیکن زبردست ڈکٹیٹر۔ان کی خاموشی بھی ایسی ہی اہانت انگیز ہوا کرتی تھی۔ ہاں ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو ضرور ایسے تھے کہ فرح نے ان سے خاصی محبت کی تھی اور......اپنی پہلی محبت کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔

''شوکی! انہوں نے دل تھام کر مضبوط لہجے میں کہا۔ وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں آگاہ کر دوں کہ میں اور احسن شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ زندگی کی مسرتوں پر میرا بھی تھوڑا سا حق ہے۔'' شوکت نے قطعی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ بڑے ٹھنڈے لہجے میں، بڑی ستھری

آنکھیں اٹھا کر اس نے پوچھا۔ ممی آپ اطلاع دے رہی ہیں یا اجازت طلب کر رہی ہیں؟

اجازت؟ فرح حیرت زدہ رہ گئیں۔ اجازت؟ بیٹے سے؟ میں صرف تمہارا ردعمل جاننا چاہتی ہوں شوکی ۔ پھر ذرا الجاجت سے بولیں ۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں یقین کرو۔

''ممی ۔ میں اپنا ردعمل تو اسی وقت سے ظاہر کر رہا ہوں جب سے میں نے آپ کے اور ان کے درمیان بڑھتی ہوئی قربت کو محسوس کیا ہے آپ ہی نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں ۔ ماں، میں اس آدمی سے کسی قسم کا رشتہ قائم کرنے سے پہلے اس کے سامنے سے ہٹ جانا پسند کروں گا۔ مجھے وہ بوالہوس بڈھا سخت ناپسند ہے۔'' وہ پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

بڈھا بوالہوس.........فرح بت بنی رہ گئیں۔ احسن بمشکل تمام پنتالیس برس کے تھے ۔ انتہائی سنجیدہ، شریف اور باوقار، کس بدتمیزی سے شوکت نے ان کا ذکر کیا تھا۔ کتنی بڑی گالی دی تھی ۔ پھر بھی انہوں نے اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ رفتہ رفتہ وہ شوکی کو سمجھا لیں گی ۔

ایک مہینہ گذر جانے کے بعد بھی شوکت کا رویہ برقرار رہا تھا۔ فرح کی ساری کوششیں بیکار گئیں ۔ وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا اور پچھلے ہفتے سے تو کھانا بھی اپنے ہی کمرے میں کھا رہا تھا۔ ایک دن فرح نے دیکھا کہ وہ اپنا سامان پیک کر رہا ہے اور قمیض کی آستین سے آنسو پونچھتا جا رہا ہے ۔ وہ خاموشی سے کھڑی دیکھتی رہیں ۔ وہ ننھا سا تھا تو کئی بار اسی طرح آستین سے آنسو پونچھتا گھر میں گھستا تھا۔ کبھی کسی کھلونے کے ٹوٹ جانے پر، کبھی کسی زیادہ مضبوط بچے سے پٹ جانے پر۔

سوٹ کیس تھام کر وہ ان کی طرف بڑھا۔ ''ممی میں جا رہا ہوں''

کہاں؟ فرح کا لہجہ ابنارمل حد تک نارمل اور پرسکون تھا۔

"جہاں میرا جی چاہے۔ اور مجھے اس کے اور آپ کے روپیوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا سہارا خود بن سکتا ہوں۔ آپ خوش رہئے۔ زندگی کی مسرتوں پر یقیناً آپکا حق ہے۔" اس کے لہجے میں تیزاب کی کاٹ تھی اور آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

شوکی...... فرح نے بلا جھجک اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اور اس کے گھنے بالوں سے ڈھکے سر پر ہونٹ رکھ دیے۔ وہ ایک لمحہ اٹھارہ برس کی ساری تصویریں ہاتھوں پر اٹھائے گذر گیا۔ پالنے میں ہمکتا ننھا شوکی۔ دودھ کی بوتل تھامے نپل سے دودھ چسکتا شوکی۔ سلیم کے کاندھوں پر چڑھا، ہنستا کھلکھلاتا شوکی اور پھر ان کالی اندھیری، کبھی نہ ختم ہونے والی راتوں کے اندھیرے کو کسی لائٹ ہاؤس کی طرح کاٹتا شوکی۔ زندگی اس کے بغیر کیسی ہوگی۔ وہ جوان کے جسم سے ٹوٹ کر نکلا تھا، جو سلیم کے جسم کا ایک حصہ تھا۔ کئی احسن مل کر بھی اس کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔

شام کے ملگجے اجالے میں ماں بیٹے کے آنسو گنگا جمنا کے پانیوں کی طرح آپس میں گھل گئے۔

فرح احسن سے کنارہ کش ہوتی چلی گئیں۔ ٹوٹے ہوئے دل کا رفو کرتے کرتے پانچ برس گذر گئے۔ وقت جواب تک ان سے ہارتا چلا آیا تھا۔ یکایک دفاع کو کمزور پا کر ٹوٹ پڑا۔ ان کے شانے جھکنے لگے اور آنکھوں کے گوشوں میں لکیریں نمایاں ہو چلیں۔

شوکت نے بزنس مینجمنٹ کا کورس مکمل کر لیا تھا۔ اسے بڑودہ کی ایک فرم میں بڑی اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اس دن وہ بوکھلائی بوکھلائی سی سارے گھر میں گھوم رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہوں یا رنجیدہ۔ ذہن میں احسن اور سلیم کی شبیہیں گڈ مڈ ہو رہی تھیں زخم پر بندھے کھرنڈ اکھڑ گئے تھے۔ شوکت کی موجودگی کے احساس

کا نازک سہارا ختم ہو جانے کے بعد وہ کیسے رہیں گی۔ شوکت کو ایک مقامی فرم میں بھی ملازمت مل رہی تھی۔ لیکن اس نے بڑودہ کو اس لیے ترجیح دی تھی کہ اس فرم کی شاخیں غیر ممالک میں بھی تھیں اور وہاں سے اسے باہر جانے کے مواقع مل سکتے تھے۔ اس کا مستقبل زیادہ روشن تھا۔ ''دلی۔ دلی۔ دلی۔ ماں میں دلی سے عاجز آ گیا ہوں۔ یہ کیا کہ انسان ایک جگہ کھونٹے کی طرح گڑ جائے......''

اس نے فرح سے کہا تھا۔

وہ اس کے تازہ ڈرائی کلین کئے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں جما رہی تھیں کہ دو ملے جلے قہقہوں نے انہیں چونکا دیا۔ شوکت ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ لڑکیاں اکثر اس کے ساتھ آتی تھیں۔

لیکن گروپ میں۔ یہ لڑکی تنہا تھی۔ پھر یہ کہ وہ اسے لے کر سیدھا ان کے کمرے میں یہ چلا آیا تھا۔ وہ دونوں باتیں نئی تھیں۔

''ممی یہ پروین ہے۔ اور پروین یہ ممی''

''HI Ma'' لڑکی دیسی امریکن لہجے میں کہہ رہی تھی۔

شوکت نے بات جاری رکھی۔ پروین میری بہت گہری دوست ہے۔ اور ممی۔ ممی۔ ہم لوگ شادی کرنے والے ہیں۔ میں نے سوچا جانے سے پہلے آپ کی ہونے والی بہو کو آپ سے ملا دوں۔ فرح کو محسوس ہوا کہ سارا گھر گھوم رہا ہے۔ لانبے لانبے یوکلپٹس اور چھتنار گل مہر کے درختوں سمیت۔ پھر سارے پہاڑ، ساری ندیاں، ساری دھرتی سب گھومنے لگے۔ لیکن انہوں نے سنبھالا لیا۔ آنکھیں جھپکا کر دھند کے پیچھے سے لڑکی کو غور سے دیکھا اور زبردستی مسکرائیں۔ بے حد لانبی، بے حد دبلی، خاصی کالی، فیڈ ڈ جینز اور کسی پتلے کپڑے کے بلاوز میں ملبوس وہ لڑکی اس خانے میں ہرگز نہیں فٹ ہوتی تھی جس میں انہوں نے شوکت کی

دلہن کو رکھا تھا۔ اور بہت سارے خواب بنے تھے۔ لیکن انہوں نے لڑکی کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور کمزور لہجے میں بولیں "کب کر رہے ہو تم لوگ شادی؟ انوٹیٹنشن کارڈ بھیجو گے نا؟"

شوکت زور سے ہنس پڑا۔ میں نے کہا تھا نا کہ ممی گریٹ ہیں۔ اور اس نے انہیں گود میں اٹھالیا، گھما ڈالا۔

گریٹ...... برسوں پہلے پاپا نے کہا تھا "فرح تم کوئی ایسا کام نہیں کروگی جس سے گھر کی عزت مٹی میں ملے۔ تم گھر کی آبرو ہو بٹیا۔" اور وہ خاموشی سے کالج کے دنوں کی اپنی اوّلین محبت کو دفن کر کے سلیم کے ساتھ بیاہ کر چلی گئی تھیں۔ نہ صرف گئی تھیں بلکہ سلیم کو عزت دی تھی، ان سے محبت کی تھی۔

گریٹ! سیتا، ساوتری، مریم، فاطمہ، ماں، انّ پورنا، گرہ لکشمی۔ سب گریٹ۔ تم شوہر ہو یا بیٹے یا باپ۔ تم نے میرے گرد یہ سارے حصار کھینچ دیے ہیں اور مجھے ان میں قید کر دیا ہے کہ میں ساری 'جائز' نعمتیں بھی اپنے اوپر حرام کرلوں۔ اور تم — تمہارا جہاں جی چاہے منھ مارتے رہو۔ کائنات تمہاری ہے۔ یہ آسمان، یہ زمین۔ ان سب پر تمہارا نام لکھا ہوا ہے۔ پیر پیغمبر دیوتا سبھی تمہارے حق میں فیصلے صادر کرتے ہیں کہ وہ بھی تمہارے ہم جنس ہیں۔ لیکن میں — میں فرح سلیم احمد آج اِن حصاروں کو توڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔

انہوں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ وہ بوڑھی اب بھی نہیں تھیں۔ اور ہوتیں بھی تو کیا۔ رفاقت اور محبت حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

دوسرے دن انتہائی اعتماد کے ساتھ وہ احسن فیاض کے کیبن میں داخل ہوئیں اور ان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بولیں۔ "احسن ہم شادی کر رہے ہیں۔"

☆☆

حجّو

جاڑوں میں موٹے ملائم لحاف میں لپٹے وہ روئی کے بنولے جیسے دکھائی دیا کرتے تھے۔ ننھے منے، جھکے ہوئے شانوں کی وجہ سے کچھ گول گول سے۔ پوپلا منہ اور موتیا بند کے آپریشن کے بعد لگی ہوئی موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے خوفناک سی معلوم ہوتی ہوئی آنکھیں۔ بچے ان میں براہ راست جھانکنے سے کتراتے۔ دو چار چیزیں ہمیشہ ان کے پاس رکھی نظر آتیں۔ پن کٹی پنج سورہ، نیم کی سنٹی اور حجو۔

حجو کو نانا نے دو تین برس پہلے دریافت کیا تھا۔ دبلا پتلا، گورا سا کوئی چھ سات برس کا بچہ۔ ایک غریب، شریف اور کثیر العیال خاندان پڑوس میں تازہ واردان، کی حیثیت رکھتا تھا۔ خاتون خانہ آئے دن کے حمل اور زچگیوں میں مبتلا رہتیں اور صاحب خانہ غم روزگار میں۔ ایسے میں حجو کا دن دن بھر نانا حضرت سے چمٹے رہنا ان کے لئے قطعی قابل اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ شاید بخوشی قابل قبول گھر کے بچے البتہ حجو سے اتنا ہی چڑنے لگے تھے جتنا نانا حضرت کی نیم کی سنٹی سے چڑا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ بیر تھا خلیق اور منّی کو۔ گروپ میں کئی لڑکے بالے ہوں تو بھی نانا اکثر خلیق کو ہی پکارتے تھے۔ دانتوں کی قلت کی وجہ سے آواز صاف نہ نکلتی۔ وہ خلیق کو قلیق، کہتے اور کچھ یوں آواز لگاتے'' ابے قلے......اے......ق۔

ایک تو خلیق سے قلیق اس پر ابے سے آراستہ، اور پھر سات سروں میں پڑتی پکار۔ خلیق میاں جل کے کوئلہ ہی تو ہو جاتے لیکن بغاوت کی جرأت نہیں تھی۔ نانا حضرت تو ان کی امی

کے نانا تھے۔امی انہیں ایک کونے میں رکھ کر کچھ بھول سی گئی لگتی تھیں لیکن پھر بھی وہ تھے تو ان کے نانا۔اسلیے مصنوعی خوشدلی طاری کر کے جواب دینا ہی پڑتا......''جی نانا حضرت''

''ابے ادھر تو آ......''بادل نخواستہ خلیق میاں پاس بھی چلے جاتے۔نانا اس وقت کسی بوڑھے شکرے سے مشابہہ لگتے۔ویسی ہی پار نکل جانے والی تیز نظریں ٹیڑھی ناک، چہرے پر خشونت۔بوڑھے کھوسٹ۔یقینا قابل نفرت۔میاں خلیق احمق الذی، اگر ہاتھ میں کھانے کی کوئی چیز ہوتی (جو اکثر ہوا کرتی تھی) تو جھٹ ہاتھ پیچھے کر لیتے۔نانا فوراً پوچھتے۔کیالایا......؟

''کچھ تو نہیں نانا......''گھسا پٹا، رٹا رٹایا جواب ہوتا۔

''ایں جھوٹے! ہاتھ دکھا۔ سامنے لا ہاتھ۔''بسورتے ہوئے خلیق ہاتھ سامنے کرتے۔کبھی مٹھیوں میں خشک میوے ہوتے، کبھی مونگ پھلیاں، کبھی چنے کرمرے، کبھی کوئی پھل یا گنڈیریاں۔

''اچھا چلغوزے ہیں۔لا، جو کو بھی دے۔''نانا کا حکم نہ ماننے کی مجال نہیں تھی لیکن اپنے حصے کی نعمتوں میں سے جو کا حصہ نکالتے ہوئے وہ ایک قہر آلود نظر ضرور اس کی طرف پھینک دیا کرتے تھے۔

پھر تو''لا، جو کو بھی دے''گھر میں محاورے کی حیثیت اختیار کر گیا۔منن ایک نمبر کے بد معاش اور مشترکہ کنبے میں رہنے والے بہت سارے بچوں میں سب سے بڑے بھی۔ وہ اکثر چھوٹے بہن بھائیوں میں سے کسی کو پکڑ لیتے۔''ابے فلانے''وہ نانا کی نقل اتارتے ہوئے کسی بچے کا نام لیتے اور کہتے''کیالایا......؟ گنڈیریاں؟ لا، جو کو بھی دے''اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہوتا اس میں سے ایک مٹھی اپنے قبضے میں کر لیتے۔کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بھائی بہن خوشی خوشی منن بھائی کو جو مان کر، خراج ادا کر دیا کرتے تھے۔انہیں بدتمیز منن نے ایک دن نانا کا نام تجویز کیا ''منقار طوطی۔''نانا حضرت کی ناک بڑھاپے میں پتلی ہو کر کچھ نیچے کو جھک گئی تھی۔ بچہ پارٹی بہت خوش ہوئی اور منن بھائی کو خوب داد ملی۔

منقار طوطی کو جاڑا بہت لگا کرتا تھا۔شاید سبھی بوڑھے لوگوں کو لگا کرتا ہے اس لیے کہ قدرت اپنے دیے ہوئے سارے زرہ بکتر اتار لیتی ہے کہ حضرت عزرائیل کو زیادہ دقت نہ ہو۔

لحاف کے باوجود وہ پاس میں دہکتی ہوئی انگیٹھی بھی رکھوالیا کرتے تھے۔ جب سے ان کی دنیا میں جو کا نزول ہوا تھا انگیٹھی کی بھوبل میں یا آلو پڑے رہتے یا شکر قند۔ ارے جو۔ وہ لحاف میں گھسے ہوئے چندھی چندھی آنکھیں چمکاتے۔ دیکھنا بیٹا آلو ہو گئے؟ جو آلو نکالتا۔ ہتھیلی پر لیکر جلدی جلدی ادھر اُدھر گھماتا، پھونکیں مارتا۔ ہاتھ جلتے اور آلو گر پڑتا تو نانا ہنس دیتے۔ ساتھ میں کھلکھلاتا جو۔ معصوم، بے ریا کھنک دار ہنسی۔ بے حد خوش وخرم ہنسی۔ ایسی ہنسی جب ہی پھوٹتی ہے جب دنیا صرف بھوبل میں بھنے ایک آلو تک محدود ہو۔

جو کو نمک لگا کر آلو کھاتے (یا کچھ بھی کھاتے) دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہوتے۔ کبھی کبھی تھوڑی بہت کوئی چیز محض جو کا ساتھ دینے کو خود بھی پپول لیتے۔ اس وقت ان دونوں کے چہرے ایک عجیب سی طمانیت اور سرخوشی سے روشن ہوتے۔ کھاپی کے جو کود کر ان کے بستر میں گھس جاتا اور ننھے منے ہاتھوں سے ہولے ہولے ان کا سر دباتا۔ یا کچھ نہیں تو شانوں پر ہاتھ رکھ کر پاس بیٹھا رہتا۔ نانا اونگھنے لگتے اور اونگھتے اونگھتے سوچتے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ سارے حواس کند ہو چلے تھے اور سارے جذبات بھی۔ دوستی، دشمنی، محبت نفرت سب وقت کی نذر ہو چکے تھے بس ایک تنہائی کا احساس زندہ تھا۔ میلے میں ماں باپ سے بچھڑ جانے والے بچے جیسی کیفیت جو اکثر دل کو سالتی رہتی تھی۔

بوڑھا ہو کر انسان عجب خبطی ہو جاتا ہے۔ خاتون خانہ کہتیں جو ایک جوان عورت تھیں اور بھرے پڑے مشترکہ کنبے کی فرد۔ کئی بچوں کی ماں۔ ''نانا حضرت سنک تو واقعی گئے ہیں'' ان کے شوہر کے چھوٹے بھائی نے کہا۔ ''گھر میں اتنے سارے بچے موجود اور نہ جانے کہاں سے یہ آخور کی بھرتی اٹھالائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ قطعی بھول گئے کہ گھر کے بچے نانا کے پاس بیٹھتے کب تھے۔ وہ پکڑ پکڑ کے بٹھاتے اور بچے دھتا بتا کر پھر سے اڑ جاتے۔ کہانی کا بھی لالچ نہیں تھا۔ نانا کہانی سنانے بیٹھتے تو درمیان میں اونگھ جاتے۔ ایک بات کو چار بار دوہرانے کے بعد پوچھتے ''ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں؟''

خود منی اور خلیق کی امی جنکے وہ حقیقی نانا تھے صبح شام ایک بندھے ٹکے روٹین کے مطابق ان کے پاس آیا کرتی تھیں۔ نانا کچھ چاہیئے؟ ان کا سوال بھی بندھا ٹکا ہوا کرتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھتیں...... پن کٹی میں ان کے لئے پان کوٹ دیتیں۔ نانا اپنا پرانا راگ چھیڑتے۔ تمہاری نانی

مریں تو مریں۔ بیٹی تمہاری ماں بھی چلی گئیں میری زندگی میں۔ میری سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ منن کی امی بے دلی سے سنتیں۔ کبھی کبھار کہہ اٹھتیں جو چلے گئے وہ چلے گئے نانا۔ ان کا مرثیہ کب تک پڑھئے گا۔ جو زندہ ہیں ان کی طرف دیکھئے۔

نانا کہنا چاہتے۔ کب دیکھوں، کس وقت دیکھوں، تم بیٹھو نا میرے پاس، تمہاری طرف ہی دیکھوں مگر تم میری نواسی میری بڑی بیٹی کی نشانی، تم تو اٹھنے کو پرتول چکی ہو۔ ابھی تمہیں یاد آ جائے گا کہ دودھ میں جامن نہیں ملایا گیا ہے۔ قورمے اور دو پیازے کے لیے گوشت علیحدہ نہیں کیا گیا ہے اور ملازم چھوکرے کو سودے کی فہرست نہیں تھمائی ہے۔ مگر وہ چندھی آنکھیں پٹپٹاتے خاموش رہ جاتے۔ ان کے ساتھی تو وہی تھے۔ وہ سارے مرے ہوئے لوگ جو ان کے تخیل میں آ کر ان سے باتیں کیا کرتے تھے۔ زندہ کی دنیا مردوں سے آباد تھی اس لیے کہ جو زندہ اور حقیقی تھے وہ ان کی گرفت سے باہر تھے۔ اس لامتناہی سناٹے میں ججو کا نزول کسی مسیحا سے کم نہیں تھا۔

نانا نے اس کے لیے بغدادی قاعدہ منگوا دیا تھا اور پھر گلستاں اور بوستاں بھی۔ ججو کو ان سے پڑھنے میں بہت مزا آتا۔ پڑھاتے پڑھاتے وہ خرخر کر کے سونے لگتے اور ججو بھی اونگھ جاتا۔ کچھ دن کے لیے اس کے والد نے اسے حافظ جی کے پاس بٹھایا تھا۔ اونگھنے پر وہ چھڑی سے ایسی دھنائی کرتے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ ان بچوں سے تو انہیں خاص بیر تھا جو گھر سے ان کے لیے حلوہ، ملیدہ قسم کی چیزیں نہ لا سکیں اس لیے ججو کچھ زیادہ ہی پٹ جایا کرتا تھا۔ یہ استاد اچھے ملے تھے جو خود تو سوئیں ہی ساتھ ہی اس سے بھی پوچھیں نیند آ رہی ہے بیٹا؟ اچھا سو لے تھوڑی دیر۔ جاڑوں میں نرم گرم لحاف اور گرمیوں میں خس کی ٹٹی۔ اونگھنے کے باوجود ججو خاصہ چل نکلا۔

تراسی برس کی عمر پوری کر کے نانا حضرت سدھارے تو اس وقت بھی ججو ہی ان کے پاس تھا۔ اسی دن اسے نانا کے ہاتھ سے آخری تحفہ بھی ملا تھا۔ منن میاں کی مرزئی۔

جاڑوں کا موسم تھا اور کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ججو لحاف میں گھسا ہونے کے باوجود کپکپا رہا تھا۔ نانا نے اپنی کمزور رعشہ زدہ آواز میں پکارا۔ منن...... او منن...... ارے میاں تمہاری وہ مرزئی کہاں ہے۔ وہی جس میں چھید کر لائے تھے اور تمہاری امی ناراض ہو رہی تھیں۔ منن میاں کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ چھید، وہ تو امی نے بھر دیا تھا نانا حضرت!

''اچھا کیا تھا۔ اچھا کیا تھا۔ مگر وہ ہے کہاں۔ جاؤ، لے کے آؤ تو۔ شاباش۔''

منن نے سوچا کہ اب اگر وہ سوال جواب کرتے ہیں تو نانا کا پارہ چڑھ جائے گا اور وہ اس ذلیل حجو کے سامنے انہیں ذلیل کر کے رکھ دیں گے۔ ''ابے منن۔ ارے جاتا کیوں نہیں ہے شیطان۔ جا مرزئی ادھر لا۔ حجو کو دے'' اس لیے وہ چپ چاپ کان دبا کر مرزئی لے آئے۔ ان کی توقعات کے عین مطابق وہ نانا نے حجو کو پہنا دی۔ پھر کچھ دیر بعد نانا کو نیند آ گئی۔ اس نیند سے وہ کبھی جاگ نہیں سکے۔ منن کی امی شام کا روٹین پورا کرنے ان کے لیے ادرک کی چائے لیکر آئیں تو معلوم ہوا کہ اب انہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔

حجو بہت دن تک صدمے کی کیفیت سے دوچار رہا۔ نانا نے مرنے کا کوئی سگنل نہیں دیا تھا اس لیے وہ ذہنی طور پر ان سے بچھڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی بے رنگ و بو اور محبت سے عاری دنیا میں جو جھولی بھر شفقت نعمت غیر مترقبہ کی طرح آ گئی تھی وہ اس سے اچانک یوں چھن جائے گی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ موت زندگی کا کیسا قطعی، یقینی اور حتمی اختتام ہے اس ذیل میں حجو کی معلومات صفر تھیں۔ چہارم کے دن اس نے ایک پورا سپارہ پڑھا اور پورا یقین بھی کیا کہ اس کا ثواب ان تک پہنچے گا۔ تصور کی آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ فرشتے اس کا بھیجا ہوا ثواب چاندی کی کشتی پر رکھ کر، زرتار خوان پوش سے ڈھک کر نانا تک پہنچا رہے ہیں اور نانا اسے وصول کرتے ہوئے بہت خوش ہو رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی کشتیاں انہوں نے لاپرواہی کے ساتھ کونے میں ایک کے اوپر ایک رکھوا دی ہیں ''بعد میں دیکھیں گے۔''

حجو اس گھر میں اس کے بعد پھر کبھی نہیں آیا۔ بس ماضی کی کرچ بنا لوگوں کے دل میں چبھتا ضرور رہا۔ عاقل بالغ، خودمختار، برسر روزگار وغیرہ وغیرہ اور سب سے بڑھ کر تو شادی شدہ ہو کے بھی منن میاں کے مزاج کا پاجی پن ویسے ہی برقرار تھا۔ وہ اپنی بیوی تک کو چھیڑنے سے باز نہ آتے۔ چھوٹی سالی کا نام انہوں نے رکھ دیا تھا حجو کہ منن میاں کی شادی کے وقت وہ کوئی پانچ برس کی تھیں اور اپنی آپا سے اسقدر مانوس کہ دلہن بنی آپا کی ڈولی میں بیٹھ کر ان کی سسرال تک چلی آئی تھیں۔ لوگوں نے بھیج دیا تھا کہ کہیں ہڑک نہ جائیں۔ منن کبھی ان کی خیر خبر لیتے تو بیوی سے کہتے ارے وہ کہاں ہیں آپ کی...... ارے وہی۔ ای حجو۔ بیوی کو خاندان میں گھل مل جانے کے بعد حجو کی تاریخ سے پوری واقفیت ہوگئی تھی اس لیے وہ بڑے زور سے تنکتیں '' نوج نہ جانے کس لاخیرے کا نام دے رکھا ہے آپ نے ہماری پھول کو۔'' '' وہ پھول ہوں یا پتی، ہیں تو آپ کی حجو۔

''خلیق میاں ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے اور انہیں کچھ اور بھی یاد آ جاتا۔ ارے یہ منن بھائی۔ اسقدر کے پاجی۔ انہوں نے تو نانا حضرت کا نام رکھا تھا منقار طوطی۔

نقش برآب...... نقش برآب۔

منن میاں نے رعشہ زدہ ہاتھ سے آنکھوں پر چھجہ بنایا اور دل ہی دل میں نقش برآب کی گردان کرتے ہوئے گنگا کی سطح پر رواں سبک رو کشتیوں کو انتہائی بیزاری اور بوریت کے عالم میں دیکھا۔ دور وہ سارے کے سارے ڈوب رہے تھے اور ڈوب ڈوب کر ابھر رہے تھے۔ امی۔ امی کے نانا۔ نانا کا جو۔ پھر منن میاں کی بیوی، ان کی چھوٹی بہن جو پھول کہلاتی تھیں اور جنہیں وہ جو کہہ کر چھیڑا کرتے تھے، میاں خلیق، وجاہت عرف وجو۔ سب پانی پر لکھی لکھائی۔ زیادہ دن زندہ رہنا بھی عذاب بن جاتا ہے۔ سب سنگی ساتھی چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ گنگا کنارے یہ فلیٹ ان کی بیوی نے محض اس علاقے کی فطری حسن کی وجہ سے لیا تھا لیکن یہاں آ کر رہنے سے پہلے ہی چل بسی۔ ایک دن منن میاں بھی چل بسیں گے لیکن ابھی تو وہ وقت کاٹنا ہے جو ان کی قسمت میں لکھا ہے۔ وہ ٹیرس پر آرام کرسی ڈالے اخبار پڑھتے، قریب ہی خدا بخش لائبریری تھی، وہاں چلے جاتے۔ کچھ کتابیں نکلواتے اور واپس آ کر انہیں چاٹنے میں جٹ جاتے مگر اب کچھ دنوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کیوں پڑھتے ہیں۔ کیا امتحان دینا ہے؟ کوئی مقالہ لکھنا ہے؟ آخر کو اپنے تمام علم و آگہی کے ساتھ وہ جلد ہی دفن ہو جائیں گے، مٹی میں مل جائیں گے، ہواؤں میں رُل جائیں گے جیسے وہ سارے جنہوں نے گنگا کے کنارے صاف ستھری لپی پتی جھونپڑیوں پر سبز بیلیں چڑھائی تھیں اور مقدس ویدوں کی تخلیق کی تھی۔ لیکن۔ لیکن یہ تو بڑی خطرناک علامت ابھر رہی ہے کہ پڑھنے سے بھی جی اچاٹ ہو رہا ہے۔ پھر وہی لیکن۔ لیکن وہ کریں کیا۔ تین بیٹیوں اور چار بیٹوں میں سے صرف ایک بیٹا پاس رہ گیا تھا۔ چالیس برس کا کنورا، جھکی۔ صبح سویرے نکلتا۔ دیر رات کو گھر لوٹتا۔ رسماً اور اخلاقاً باپ کی خیرت دریافت کرتا، دو چار سیاسی نکتوں پر بحث کرتا اور سونے چل دیتا۔ صبح کو ایک پرانی لگی ہوئی ملازمہ آتی۔ ادھیڑ عمر، کم سخن بلکہ گھُنّی۔ خاموشی سے صفائی کرتی، ہلکا سا لنچ تیار کرتی اور واپس ہو جاتی۔ ادھر چھ برس بعد سب سے چھوٹی بیٹی آئی تھی۔ وہ انگلینڈ میں بسی ہوئی تھی۔ شوہر اور وہ دونوں ڈاکٹر تھے۔ اس کے شوہر تو نہیں آ سکے تھے۔ تین بچے ساتھ تھے۔ منن میاں نے سوچا تھا پندرہ بیس دن تو وقت گذاری کا انتظام ہوا لیکن بیٹی کو شاپنگ سے فرصت کم تھی۔

وہ تمام بدیسی دوستوں کے لئے دیسی تحفے اکٹھا کر رہی تھی۔ پھر ادھر کے بسے ہوئے ہم وطنوں کی فرمائشیں الگ تھیں۔ بنارسی ساڑیاں، ریشم کے تھان، چکن اور پٹی کے کام کے سوٹ۔ بچے انگریزی میں روتے، انگریزی میں ہنستے، گرمی کا شکوہ کرتے اور بوریت کا بھی اور ایک کمرے میں محدود یائی۔ وی دیکھتے یا دھینگا مشتی کرتے۔ 'گرینڈ پا' ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ سچ پوچھو تو منن میاں کو گھر کا نظام ہی بگڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً سٹھیا گئے تھے۔ لوگ نہ ہوں تو اکیلا پن کھائے اور لوگ ہوں تو ہنگامے سے جی گھبرائے۔ منن میاں کو بڑھاپے کے باوجود نماز روزے سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن ادھر امی مرحومہ کا قول اکثر یاد آتا رہتا تھا۔ کہتی تھیں جی گھبرائے تو نماز پڑھ لیا کرو۔ انہوں نے بے دلی سے وضو کیا۔ جانماز اٹھائی۔ سورج گنگا کے دوسرے کنارے کی طرف جھک رہا تھا لیکن عصر کا وقت باقی تھا۔ شام کی ڈیوٹی کے لیے آئی ملازمہ نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کیرم میں مصروف بچوں نے دروازہ نہیں کھولا تو وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر خود اٹھے۔ ملازمہ کے ساتھ آٹھ نو برس کی ایک بچی تھی۔

یہ کون ہے عطن کی ماں انہوں نے پوچھا۔

نواسی ہے میاں صاحب۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

پہلے تو نہیں دیکھا تھا۔؟

لڑکی نے اسے یہاں بھجوا دیا ہے۔ وہ پھر خاموش ہو گئی۔

نماز پڑھ کر بھی دل یونہی خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ شاپنگ سے نہیں لوٹی تھیں نہ گھمکو چھپڑا بیٹا۔ انہوں نے ملازمہ کی نواسی کو پاس بلایا۔ یہاں آؤ بیٹا۔ وہ سہمی ہوئی ہرنی جیسی پاس آ گئی۔

کیا نام ہے تمہارا؟

راتو......

یہ کیا نام ہوا بھلا۔ ایسی پیاری بچی کا تو اچھا سا نام ہونا چاہئے تھا۔ لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہمارا نام رحمت النساء ہے۔ اس نے ہولے سے کہا۔ اماں ہمیں راتو کہتی ہیں۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا۔ منن میاں سے ایک فوری رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ شاید پہلی بار کسی نے اس سے کہا تھا کہ وہ ایک اچھی، پیاری لڑکی ہے۔

''ہم تمہیں رحمت کہیں گے۔'' منن میاں نے کہا تو اس نے خوشی سے سر ہلایا۔ جھجک اور مکمل اجنبیت کے احساس کی وجہ سے وہ اب تک دیوار میں جڑے بڑے سے ایکوریم کی طرف سیدھا نہیں دیکھ سکی تھی۔ اب وہ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس میں تیرتی رنگ برنگی مچھلیوں کو بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ دیکھنے لگی۔ یہ ایکوریم منن میاں کے بیٹے نے خاص طور پر ان کے لئے لگوایا تھا۔ ''ننھی منی رنگ برنگی مچھلیوں اور خوبصورت سمندری پودوں کا مشاہدہ دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے اور بلڈ پریشر گھٹاتا ہے'' اس نے منن میاں کو بتایا تھا اور اپنے تئیں ان کی زندگی کی خالی جگہوں میں صحیح جملے بھرنے کی کوشش کی تھی۔ منن میاں مچھلیوں کو گھور گھور کر بھی عاجز آ چکے تھے۔ لیکن اس ننھی بچی کے لیے یہ نہایت دلچسپ تماشہ تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جاؤ— قریب سے دیکھ لو رحمت النساء۔ انہوں نے نرمی کے ساتھ بچی سے کہا اور بلبلے چھوڑنے والے ننھے سے فوارے کا بٹن دبا دیا۔ بچی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور آنکھیں حیرت سے کچھ زیادہ گول۔ وہ پہلے ذرا جھجھکی لیکن پھر قریب جا کر شیشے سے ناک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے مچھلیوں کو گننا شروع کیا۔ بڑی معصوم ننھی سی آواز تھی۔ ایک۔ دو تین۔ چار......۔

تمہیں گنتی آتی ہے؟ منن میاں مسکرائے

بیس تک آتی ہے۔ اس نے فخر سے جواب دیا۔

اس میں بیس سے کہیں زیادہ مچھلیاں ہیں۔ آگے کی گنتی سیکھو گی؟

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

اچھا رحمت...... تمہاری نانی سے کہیں گے تمہیں روز لے آیا کرے۔ پھر انہوں نے پکارا ...... بوبی، مونی، عرفی! تینوں نواسوں کو بیک وقت پکارا تھا شاید کوئی ایک سن لے اور چلا آئے۔

بوبی آیا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ اس لیے شاید اسی سے کھیل چھڑا کر بڑے بھائیوں نے اسے نانا کی طرف دھکا دیا تھا۔ اس کی مٹھی میں کچھ بھرا ہوا تھا اور اس کا منہ چل رہا تھا۔

کیا کھا رہے ہو؟

چاکلیٹس ہیں نانا ابی۔ اور ہم کیرم کھیل رہے ہیں۔ جلدی بتائیے کیا بات ہے؟

سنو بیٹا۔ ذرا ایک چاکلیٹ اسے تو دو؟

بوبی چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سجے سجائے ڈرائنگ روم میں اس لڑکی کی موجودگی کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی گندے جوتے لیکر چھم چھم کرتے فرش پر ان کے نشان چھوڑ گیا ہو۔

کسے......؟ اسکو؟ اس نے حیرت سے منن میاں کو دیکھا اور تصدیق چاہی۔

اور کون ہے یہاں میاں؟ وہ ذرا درشت لہجے میں بولے۔

بوبی نے بادل نخواستہ ایک چاکلیٹ مٹھی سے جدا کی اور جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں بولا یہ آخر ہے کون؟

جو۔ منن میاں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ناک بھوں سکوڑتا بوبی واپس ہو گیا۔ بچی حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ اتنی جلدی نام بھول گئے۔ کیسے ہیں یہ؟

صدائے بازگشت

مہیب صورت ٹرک سارے سامان کو یوں نگل گیا تھا جیسے اژدہے خاندانوں کو نگل جایا کرتے ہیں۔ چچی اماں نے کفن کے کونے سے آنسو پونچھ کر ساتھ لے جانے کے لئے آنگن میں لگے نیم کے درخت سے ایک ڈال توڑی اور سوں سُوں کر کے اُسے سونگھا۔ "ہمارے نیم کے پیڑ سے بڑی میٹھی خوشبو آتی ہے اور بڑی ٹھنڈی ہوا نکلتی ہے۔" نیم کی ٹہنی سے پنکھے کا کام لیتے ہوئے انہوں نے گھُٹی گھُٹی آواز میں کہا۔

چلو بھائی بسم اللہ۔ معراج کی مدد کو آئے ہوئے دُور کے رشتے دار علی میاں جو جائداد کی دلالی کا کام کرتے تھے کود کر سامان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ باؤں ہاؤں کرتی دیو قامت گاڑی پہلے ذرا پیچھے کو ہوئی پھر آگے بڑھی اور تیز ہوتی رفتار کے ساتھ شہر کی شاہ راہ سے کالونی کی سڑک کو ملانے والا موڑ کاٹتی معراج کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

بابو پیارے لال کی بی بی بھی کہیں سے برآمد ہوگئیں۔ پھُسر پھُسر روتی اور پلو سے آنکھیں پونچھتی۔ پچھلے کئی دنوں سے معراج ایک ایسے منظر کا حصہ بن گیا تھا جسے اس نے دیکھا نہیں تھا، صرف سُنا تھا۔ ایک بڑا سا آنگن، آنگن کے ایک کنارے چھتنار نیم کا درخت۔ بتھان میں بندھی سفید گائیں، کالی بھینسیں۔ کائی اور سنگھاڑے کی بیلوں اور مچھلیوں سے بھرا تالاب۔ بیلوں میں اُلجھے ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچے۔ نیلوفر کے سفید پھول۔

معراج کے بڑے جب آپس میں باتیں کرتے تو ہواؤں پہ یہ منظر ضرور لکھا جاتا۔ چچی

اماں اس کا ناگزیر حصہ تھیں جو جاتے وقت آنگن کے نیم سے کچھ ہری بھری ڈالیں توڑ کے لے گئی تھیں اور دادا کے دوست بابو پیارے لال کی بی بی بھی جو سُوپ میں نہ جانے کیا کیا لے کے انہیں بدا کرنے آئی تھیں اور پھُسر پھُسر روتی اور پلو سے آنکھیں پونچھتی جاتی تھیں۔

معراج کو محسوس ہوا ابھی شاید اس کے پہلو میں کھڑی شاہدہ نے بھی اس کی آنکھیں بچا کے پلو سے آنکھیں پونچھی تھیں اور ہر وقت شرارتوں پر آمادہ کھلنڈرا شہاب بھی اِدھر اُدھر کچھ اس طرح دیکھنے لگا تھا جیسے اسے ٹھیک سے دکھائی نہ دے رہا ہو۔

معراج کے بڑے، بہت سے منظر یونہی ہواؤں پہ لکھا کرتے تھے، معراج ان کا حصہ نہیں تھا لیکن درجنوں بھر لکھے جانے کی وجہ سے وہ معراج کا حصہ ضرور بن گئے تھے۔ اور بابو پیارے لال شری واستو کی بی بی کو تو نہیں لیکن اماں کو پھُسر پھُسر روتے معراج نے نہ جانے کتنی بار دیکھا تھا۔

''تم جس زمانے میں پیدا ہوئے، ہمارا قصبہ بڑا چھوٹا سا ہوا کرتا تھا۔ اماں بتایا کرتی تھیں۔ بس کوئی تین چار فرلانگ کے فاصلے پر ہی تمباکو کے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ وہاں سیار روتے تو ہمارے گھر تک آواز آتی۔ ایک مرتبہ شاید سیاروں کے ساتھ ساتھ کوئی بھیڑیا بھی آن نکلا۔ ہنگامہ ہو گیا۔ میں سمجھی یہاں بھی فساد بھڑک اٹھا۔ تب پتہ بھی کھڑکتا تو لگتا تھا فساد پھوٹ پڑا ہے۔''

ایسا کیوں تھا اماں؟ معراج یہ قصہ سنتے وقت بھی چھوٹا ہی تھا۔ زیادہ بڑا نہیں ہوا تھا۔

تم اور بڑے ہو گے تو شاید سمجھ سکو گے۔ لیکن میں تو آج تک نہیں سمجھ سکی کہ ویسا کیوں ہوا تھا جو ہوا (اور شاید کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی) واقعی اماں اس سوال کا جواب پائے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہوئیں —— بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح۔

پھر اماں؟ پھر کیا ہوا۔؟

''پھر میں نے دل میں سوچ لیا کہ میں تم تینوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکوں گی۔ زہرہ اور صبیحہ تو سیانی بھی ہو چلی تھیں۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں کبھی دنگا ہوا تو میں تم لوگوں کو کنویں میں دھکا دوں گی اور خود بھی پیچھے سے کود جاؤں گی۔ میں اس بات کے لیے خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ کنواں گھر کے آنگن میں موجود تھا۔''

کنواں بیشک گھر کے آنگن میں موجود تھا لیکن جب بھی زہرہ صبیحہ، معراج اور مشترکہ

کنبے کے دوسرے کم عمر بچوں میں سے کوئی بھی کنویں کے پاس جاتا اماں پیچھے سے مستقل آوازیں لگاتی رہتی تھیں۔ ''دیکھو مُنڈیر کے پاس سے ہٹو، زیادہ جھکنا مت......ارے جگت پہ کیوں چڑھ رہے ہو۔ جاؤ باہر کھیلو جا کے۔'' پانی نکالنے کے وقت کے علاوہ کنواں تختے سے ڈھکا رہتا تھا...... اور اماں کہتی تھیں کہ ان کا ارادہ اپنے تینوں بچوں کو کنویں مس دھکا دے دینے کا تھا۔

''ویسی بے بسی کا احساس مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔ تم بس مہینے بھر کے تھے۔ اس زچگی کے بعد میں کافی کمزور بھی ہوگئی تھی۔ پھر بھی میں نے تمہیں گود میں لیا اور دونوں لڑکیوں کو بازو سے پکڑ کر آنگن میں آ گئی۔ کنویں کے پاس۔ تبھی تمہارے دادا جو باہر نکل گئے تھے۔ خبر لائے کہ وہ ہنگامہ جس کی وجہ سے ہوا وہ محض ایک بھیڑیا تھا۔ فساد پر آمادہ انسان نہیں۔ سب لوگوں نے مل کر اُسے بھگا دیا۔ دو چار شکاریوں نے یہ فیصلہ بھی کرلیا ہے کہ کل وہ ساکھو کے جنگلوں میں اُسے تلاش کریں گے اور مار کر ہی دم لیں گے (جبکہ فساد پر آمادہ لوگوں کے لیے نہ اتنے متحد ہوتے ہیں نہ اتنے فعال)۔

پھر اماں......؟

ہمارے چھوٹے سے پرسکون قصبے میں فساد کبھی نہیں ہوا۔ بھیڑیا بھی پھر نہیں آیا۔ تمبا کو کے کھیتوں کی جگہ کل کارخانے لگنے لگے۔ قصبہ ضلع میں تبدیل ہوگیا۔ مگر وہ جو بھاگے تھے وہ بھی نہیں آئے۔

وہ کون اماں؟

تمہارے نانا......اور ماموں......اور تمہارے چچا...... چچی اماں جو میری خالہ زاد بھی ہوتی تھیں اور چلتے وقت آنگن میں لگے نیم کی کڑوی کڑوی سی مہک کو میٹھی خوشبو بتا رہی تھیں۔

دادا کے دوست جن کا سر دادا کی طرح سفید تھا اور املی کے چیّں جیسی آنکھیں تھیں اور تربوز کے بیج جیسے کالے کالے ٹوٹے ٹوٹے سے دانت تھے۔ یعنی پیارے لال شری واستو۔ ارے وہی جنگی بی بی چچی اماں کے جانے کے وقت سوپ میں نہ جانے کیا کیا رکھ کے لائی تھیں اور پھسر پھسر روتی جاتی تھیں، اکثر کچھ ایسے 'کبت' سناتے تھے جن میں نانا کا ذکر ہوتا تھا مثلاً:

نانا۔ نانا۔ بھوک لگی ۔ کھالو بیٹا مونگ پھلی

مونگ پھلی میں دانا نہیں ۔ تم ہمارے نانا نہیں

یا ! اے ماں بولو، اے ماں بولو نانا پھر کب آئیں گے، انگلی پکڑ کر ہمیں گھمانے اب پھر کون لے جائے گا۔ معراج کو یہ نانا کوئی ایسی ہی ہستی لگتے تھے جو قصے کہانیوں میں ہوتے ہیں مثلاً حاتم طائی، الہ دین، چچا چھکّن، کالا چور، چڈّ اگلخیر وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب ایک دن معراج نے آنگن میں گھوم گھوم کر ٹھیک دادا پیارے لال کی بتائی ہوئی دُھن میں اے ماں بولو...... اے ماں بولو گایا تو اماں کی توے پر پڑی چپاتی جل کر کالی کوئلہ ہوگئی...... وہ پھسر پھسر رونے جو لگی تھیں۔ معراج کے ابو، بابو پیارے لال سری واستو کو چچا کہا کرتے تھے اس دن جل کر بولے ان کا نام چچا سڑی واستو رکھ دینا چاہیے۔ یعنی چچا جو واستو میں سڑی ہو گئے ہوں۔ سن ستر کے آس پاس نانا کے مرنے کی خبر آئی۔ اس وقت معراج خاصہ بڑا ہو چکا تھا مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ذرا ذرا سی بات پر رو پڑنے والی اماں روئیں کیوں نہیں؟ میں نے زندوں کو صبر کیا۔ اب میرے اوپر کسی کے مرنے سے کیا فرق پڑے گا۔ کہتے ہوئے ان کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا اور اُن پر چڑھنے والی خاموشی کی تیسری پرت بڑی بھیانک تھی۔

اماں پہلی بار خاموش ہوئی تھیں جب ان کا پورا کنبہ پاکستان سدھار گیا تھا۔

اماں کا سسرال ان کے گھر سے بس کوئی دو چار میل کے فاصلے پر تھا۔ ماں باپ، ماموں ممانی، بھائی بھابھی سب برابر ملنے آتے رہتے تھے۔ لیکن قیام پاکستان کے کچھ ہی سال بعد دادا نے ان کے گھر والوں کے آنے پر ناک بھوں سکوڑنی شروع کر دی تھی۔ ان کے بھتیجے علی احمد کو ان کے سسرال والے بقول دادا ورغلا کے پاکستان لے گئے تھے۔ دادا کا خیال تھا کہ اماں کے گھر والے ان کے اکلوتے بیٹے یعنی معراج کے ابو کو بھی اسی طرح ورغلا کے لے جائیں گے۔ وہ سارا خاندان ایک ہی تو تھا۔ علی احمد کی اہلیہ اور اماں خالہ زاد بہنیں تھیں۔ دادا خاص طور پر بہو کے بھائی سے چڑتے تھے۔ جہاں وہ آئے نہیں کہ پہنچے جھپٹا مار کے۔ کبھی ابا کو ان کے پاس تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ ''آ گئے میرے شمائل کو ورغلانے۔'' وہ زیر لب بُد بُداتے اور کمر پر ہاتھ رکھ کے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ ایک دن انہوں نے حد کر دی۔ صاف صاف کہہ دیا...... کیوں میاں...... کیوں چلے آتے ہو؟ شمائل اور اپنی بہن کو ساتھ چلنے کے لئے پٹی پڑھا رہے ہو؟ کان کھول کے سن لو میں تمہارے جناح کے اس دو قومی نظریے کا کٹر مخالف ہوں اور یہ کہ مجھے باپ دادا کی زمین سے بے حد محبت ہے میں یہیں مروں گا اور یہیں دفنایا جاؤں گا اور شمائل اور اس کے بچے آیا

کریں گے میری قبر پر چراغ جلا کر فاتحہ پڑھنے۔ پوری مسلم آبادی کا مکمل انتقالِ مکانی ممکن ہی نہیں تھا۔ نہ کبھی ممکن ہو سکے گا۔ کبھی سوچا تمہارے لیڈران نے کہ جو یہاں رہ جائیں گے ان کی راہ میں کتنے کانٹے ہوں گے اور کن ناکردہ گناہوں میں ملوث کیا جائے گا انہیں؟''

''چچا — واسع ماموں بھی آج شاید دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے...... شمائل بھائی میرے بہنوئی ہیں۔ سگی بہن کے شوہر۔ ان کے مستقبل سے میرا سروکار ہے۔ اور میں ورغلا نہیں رہا ہوں۔ صحیح رائے دے رہا ہوں......'' تمہاری رائے کتنی صحیح ہے اس کا اندازہ تمہیں ابھی نہیں ہوگا۔ تم جیسے بہت سے خودمرکز لوگوں نے ہزاروں لاکھوں بے غرض لوگوں کی زندگیاں داؤں پر لگا دی ہیں۔ میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں میاں...... بہن کی سسرال میں اتنی آرجار زیب نہیں دیتی۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ جانے لگو گے تو ہم خود تمہیں آکے خدا حافظ کہہ دیں گے۔ اس سیلِ بلا میں ابھی نہ جانے کتنے اور بہیں گے۔'' دادا نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

واسع ماموں پھر کبھی نہیں آئے۔

سن اکہتر میں ان کا لٹا ہوا کنبہ بنگلہ دیش سے ہندوستان پہنچا۔ جیسے سیلِ بلا نے پھر انہیں خس و خاشاک کی طرح واپس ساحل پر لا پٹکا ہو۔ ماموں ان میں بھی نہیں تھے۔ وہ لاپتہ ہو گئے تھے۔ لاکھوں کی جائداد (جس کے بارے میں انہوں نے خط میں لکھا تھا اور ابا کو بتایا تھا کہ انہوں نے واسع ماموں کے ساتھ نہ جا کے کتنی غلطی کی تھی) لٹ چکی تھی۔ آنے والے صرف اپنے تن کے کپڑے لے کے آئے تھے۔ پھر وہ لوگ کراچی چلے گئے۔ یہاں وہ غیر ملکی تھے منہ سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر، جو واپس نہیں لئے جا سکتے۔ اماں پر خاموشی کی دوسری پرت اسی موقعے پر چڑھی تھی جب انہیں پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ لاپتہ (شہید) ماں جائے کا کنبہ اب ہندوستان میں نہیں رہ سکے گا۔

دادا اس وقت زندہ تھے جیسے قضا و قدر نے انہیں یہ سب دیکھنے کے لیے بھی زندہ رکھ رکھا ہو۔ دادا جب قیام پاکستان اور اس کے ذمہ دار لیڈروں پر تبرا پڑھتے تو منہاج کے ابو رنجیدہ ہو کر کہتے۔ بُرا تو یقیناً ہوا ابا لیکن شاید اس وقت نہ ہوا ہوتا تو اب ہوتا۔ شاید ہم انسانوں نے مل کر رہنا سیکھا ہی نہیں ہے اور شاید کبھی نہ سیکھیں گے۔ بنگلہ دیش الگ ہو گیا۔ بیروت میں دیکھئے کیا ہو رہا ہے۔ ایران عراق...... اسرائیل، ویت نام، کشمیر، پنجاب۔ ہندوستان بڑا ملک ہے۔ مضبوط

مرکز، طاقتور فوجیں، شاید اس لیے ہم نے دکن کو بچالیا۔ آسام کا مسئلہ بھی بظاہر حل کرلیا۔ اب بوڈو اودہم مچارہے ہیں، ادھر جھارکھنڈ مکتی مورچہ ہے...... ابا غیر منقسم ہندوستان میں بھی ہم زیادہ دن مل کر نہ رہ پاتے۔'

دادا کے وقت میں صرف ایک مسئلہ تھا۔ فرنگی...... اس لیے وہ موجودہ سیاسی منظر نامے کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔ پے بہ پے جادثے ان کے حواس کند کررہے تھے۔ بڑے چچا کا جوان بیٹا کراچی کے ایک شوٹ آؤٹ میں مارا گیا تھا۔ چچا چاہتے تھے اس کی شادی ہندوستان میں کنبے کی کسی لڑکی سے کریں ''وطن سے ہمارا تعلق بنا رہے گا۔ آنے جانے کے بہانے ملیں گے۔'' اس شادی کے لیے ان کی واحد منطق یہی تھی۔ جب بھی آتے قبرستان ضرور جاتے۔ گھنٹوں وہاں بیٹھے رہتے۔ محلے کے ہر شخص سے فرداً فرداً اس کی خیریت دریافت کرتے۔ امرتی ساؤ کی امرتیاں ضرور کھاتے جب کہ ڈاکٹر نے میٹھے کا سخت پرہیز بتایا تھا۔ اور تو اور ایک مرتبہ نیم کے درخت پر جھولا ڈلوا کر جھولا جھولے...... کھچڑی بالوں اور ذیابیطس کے مرض سے کھوکھلے ہوتے جسم والے چچا۔ جھولے پر بیٹھے وہ کیسے لگ رہے تھے؟ دادا نے ان پر جو گہری نظر ڈالی تھی وہ انہیں آر پار چھید کر گذر گئی تھی۔ پھر دونوں بزرگوں نے اپنے نظر نہ آنے والے آنسو گلے کے اندر ہی اندر گٹک لیے۔

تاریخ نے ایسی بھیانک غلطیاں نہ جانے کتنی بار کی ہیں۔ وہ غلطیاں جن کا تدارک ممکن نہیں لیکن کیا ان پر مٹی ڈال کر پرامن طریقے سے رہنا بھی ممکن نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے نہ جانے کتنے لوگ اپنی اپنی عمر میں پوری کر کے اس جہاں سے چلے گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

چار بھائیوں کی مشترکہ جائداد میں بڑی بڑی قانونی موشگافیاں ہوئیں اس لیے کہ بڑے چچا معہ کنبے کے پاکستان چلے گئے تھے۔ زیادہ تر جائداد معہ ٹھنڈی ہوا اور میٹھی خوشبو دینے والے نیم کے کسٹوڈین کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ معراج کو ابا نے وکالت پڑھوائی تھی۔ قصبے میں اس کا کچھ ایسا زیادہ اسکوپ نہیں تھا۔ معراج شہر آ گئے تھے۔ کراچی سے ایک دن ایک شناسا بزرگ آئے۔ ان کے ہاتھ معراج کی ماموں زاد بہن نے جو تقریباً انہیں کی ہم عمر تھی اور پاکستان میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ اپنی اور بچوں کی تصویریں بھجوائی تھیں۔ معراج کے بچوں

بچوں کے لیے کچھ تحفے بھی۔

''یہ تمہاری پھوپی ہیں۔'' معراج نے ھُما کی تصویر دکھائی۔'' تقریباً میری ہم عمر۔ جب یہ پیدا ہونے والی تھی تب ہی ماموں ممانی یہاں سے چلے گئے۔ اماں کے یہاں میں پیدا ہونے والا تھا۔ وہ بے حد روتی تھیں۔ تب میری اماں یعنی تمہاری دادی انہیں سمجھاتی تھیں کہ ایسی حالت میں رنج نہیں کرتے۔ مگر اماں کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ کافی عرصے بعد واسع ماموں نے میرے لئے ھُما کا پیغام بھجوایا۔ ابا اور دادا دونوں جھٹے سے اکھڑ گئے۔ کہنے لگے ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا ہے۔ ایک تو سیاسی حالات اتنے خراب ہوتے رہتے ہیں کہ لوگوں کا آنا جانا، خط و کتابت دوبھر ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی دردسر کون مول لے گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دادا اپنے اصولوں کے تحت قیام پاکستان کے خلاف تھے۔ اور نہرو و آزاد کے زبردست عقیدت مند۔

تب بھی ہمارے مکان کی دیواروں پر وہ توہین آمیز نعرے لکھے گئے۔ معراج کی بیٹی نے رنجیدہ آواز میں کہا جب ایک کرکٹ میچ میں ہندوستان ہارا اور پاکستان جیتا تو لڑکیوں نے مجھ سے اسکول میں کہا...... تم تو بڑی خوش ہوئی ہوگی۔ معراج خاموش رہا۔

پاپا۔ اس مرتبہ پہلی بار ایسا ہوا کہ مس انڈیا کے مقابلے میں ٹائی ہوا ٹائی بریکر کے طور پر جج نے جو سوال پوچھا وہ یہ تھا کہ اگر آپ کے بس میں ہو تو اپنے ملک کے کس ایک واقعے کو ہونے سے روک دینا چاہیں گی۔ اس لڑکی نے کہا اندرا گاندھی کا قتل۔ وہ لڑکی جیت گئی۔ اس کی جگہ ہم ہوتے تو کہتے...... ملک کی تقسیم۔ ہمارا بس چلے تو ہم وقت کا پہیہ پیچھے گھما کر پارٹیشن کو رکوا دیں۔ اس کی آواز بے حد سنجیدہ اور بھاری تھی۔

معراج نے اداسی سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ مقابلے میں حصہ لینے والی وہ حسینۂ ہند وہ کچھ نہیں جھیل رہی ہے جو میری بیٹی جھیل رہی ہے۔ اس لیے وہ اس طرح نہیں سوچتی جس طرح میری بیٹی سوچتی ہے۔

پاپا۔ اگر ملک نہ بٹا ہوتا تو شاید...... وہ حالات بھی نہ پیدا ہوئے ہوتے جنھوں نے مسز گاندھی کا قتل کرایا اور بابری مسجد بھی نہ ٹوٹی ہوتی اور......

اور بابری مسجد نہ ٹوٹتی تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا جو بس چند ماہ پہلے ہوا اور معراج

سمیت نہ جانے کتنے لوگوں کو دہلا گیا۔

کالونی سے تھوڑی دُور بنے شاپنگ کامپلکس میں ایک دوکان لوٹنے پر اٹھنے والا شوراور فتح میں سرشار نعرے معراج کے گھر تک پہنچ رہے تھے۔ شاہدہ اور زریں کے چہروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ معراج کے ہاتھ یخ ہورہے تھے۔ ''ہم موت سے نہیں ڈرتے۔'' شاہدہ نے بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں کہا تھا۔ کوئی آئے اور ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی مار دے۔ منظور ہے۔ لیکن لوگ موت بھی آسان نہیں بناتے۔ ڈر تو اس اذیت کا ہے جس سے گزرنا موت سے بدتر ہے۔ (اور میرے آنگن میں تو کنواں بھی نہیں۔)''

اسی وقت دروازے پر زور سے دستک ہونے لگی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں دہشت گہری ہوگئی۔ جیسے وہ دستک ملک الموت کے ہاتھوں دی جارہی ہو۔ پھر جے پرکاش کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی...... ''یہ میں ہوں معراج دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔ ورنہ حالات میرے قابو سے باہر ہوجائیں گے۔ ڈرومت معراج میں ہوں۔ یہ میں ہوں......''

اس ایک لمحے میں شاہدہ کے ذہن میں آیا کہ جے پرکاش خود بھی تو بلوائی ہوسکتا ہے۔ بیشک چھرا لے کر خود نہ گھونپے لیکن یوں گھر کھلوا کر چھرا گھونپنے والوں کے حوالے تو کر سکتا ہے۔ آخر پولیس فورس بھی تو ان مخبروں پر چلتی ہے جو مجرموں کی نشاندہی کرتے ہیں اور ہمارے اوپر تو پشتہا پشت سے مجرم ہونے کا ٹھپہ ہے۔ مجرم اور غدار۔ بدیسیوں کی اولاد مگر معراج نے دروازہ کھول دیا تھا۔ جے پرکاش جلدی جلدی دروازے پر سے معراج احمد۔ایم۔اے،ایل۔ایل بی ایڈوکیٹ کی تختی اتارنے میں مصروف تھا۔ پھر اس نے سب کو ہڑکا کر رکھ دیا۔ بس دو ایک کپڑے اٹھایئے اور اگر گھر میں زیورات اور کیش ہو تو رکھ لیجئے اور بس۔ جلدی کیجئے بس کوئی سوگز کے فاصلے پر دوکان لُٹ رہی ہے۔

باہر نکلتے ہوئے معراج نے دیکھا دروازے پر کسی نے چاک سے بڑے بڑے حروف میں اوم اور جے شری رام لکھ دیا تھا۔ کھانے کی میز پر سب کی پلیٹوں میں کھانا ڈالتے وقت جے پرکاش کی بیوی نے بتایا کہ یہ تجویز اسی کی تھی۔ پڑوس کے دونوں مسلمان گھروں سے جے پرکاش نے نام کی تختیاں اکھاڑ کر ان پر اوم اور جے شری رام لکھ دیا تھا۔ معراج کو وہ خود لے آیا تھا اور اشفاق کے کنبے کو ستیہ نارائن لے گیا تھا جسے کالونی کے لڑکے ستیہ نارائن گنجیڑی

کہا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں جب وہ نوجوان تھا نشہ آور دواؤں کا استعمال کیا کرتا تھا۔ بہت پیسے خرچ کر کے اس کا علاج ہوا۔ لیکن سدھر جانے اور تائب ہو جانے کے بعد بھی گنجیڑی اس کے نام سے چپکا رہ گیا۔ اشفاق یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے۔ ستیہ نارائن کبھی ان کا طالبعلم رہ چکا تھا۔

شاہدہ دل ہی دل میں سخت نادم تھی۔ ایک لمحے کو سہی، اس کے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ جے پرکاش جیسا عزیز دوست ان کے گھر کا دروازہ کھلوا کر انہیں بلوائیوں کے حوالے کر سکتا ہے۔ شاید دل کے نہال خانوں میں اماں کی باتیں تھیں جو ایسے کانٹوں کی طرح کھُبی ہوئی تھیں جن کے اوپر گوشت آ گیا تھا لیکن جو اندر اندر ٹیس دیتے رہتے اور انسانی قدروں سے اعتماد کو اٹھا دینے کا کام کرتے رہتے تھے۔

اماں کا تعلق بہار شریف کے ایک گاؤں سے تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ۴۷ء میں ہوئے فسادات کے دوران کچھ ایسے لڑکوں نے گھروں میں چھپے لوگوں اور مال کی نشاندہی کی تھی جو انہیں گھروں کے پروردہ تھے اور پشت در پشت ان کے کھیتوں پر کام کرتے چلے آئے تھے۔

سارا کچھ بڑا ہی پیچیدہ گورکھ دھندا تھا۔ کسی پرانے برگد یا سادھو کی جٹاؤں کی طرح اُلجھا ہوا۔ کھیتوں پر پُشت در پُشت کام کرنے والے اکثر درختوں سے باندھ کر پٹوائے بھی جائے تھے۔ خوشبودار دھان سے مالکوں کو ٹھار بھر کے وہ خود بھُو کے رہا کرتے تھے۔ موقعہ ملا تو اندر اندر پکتا ہوا الاو زمینیں چاٹنے لگا۔

ارتقا کے ہزاروں سال گذار کر دنیا بہت پیچیدہ ہو چکی تھی۔ قدرت نے اسے بنایا تو بہت سادہ تھا۔ اکثر اپنے بچوں یا دوسرے لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے معراج خود سوچنے لگتا تھا کہ قطعی اور حتمی کیا ہے۔ مذہب یا طبقاتی تقسیم؛ یا شخصی و اجتماعی اقتدار؛ یا محض زور آور و کمزور کا موٹا امتیاز۔ یا کچھ نہیں صرف اپنی ذاتی سہولت، اپنا مفاد۔ اس متمول مسلمان تاجر کا کپڑوں کا شوروم لوٹتے وقت شاید کسی مسلمان کو اذیت پہنچانے سے زیادہ ایک قیمتی سوٹ پیس گھر لے جانے کی مسرت ذہن پر حاوی رہی ہوگی۔'' کچھ امن پسند لوگ اگر ایک الگ جزیرہ بسا لیں تو بھی امن زیادہ دن ٹکنے والا نہیں۔ ان کی

اولادوں میں سے ہی کچھ لوگ اٹھیں گے جنکی فطرت میں شیطنت ہوگی اور امتیاز من وتو پیدا کریں گے۔'' یہ جملے جے پرکاش کے تھے پچھلے واقعے کے بعد اسے برابر دھمکیاں مل رہی تھیں۔ اور رام ناتھ تواری کو بھی۔ جبکہ تیواری جی نے کسی کو گھر میں چھپایا بھی نہیں تھا۔ محض ایک امن کمیٹی تشکیل دی تھی۔

معراج، یار مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ لوگ مجھے مار ہی دیں ایسا ہونا ذرا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ دس بیس آدمی مجھے پکڑ کر ایک طرف کو کردیں۔ ہوسکتا ہے اگلی بار میں تمہاری حفاظت نہ کرسکوں۔ تم اپنے کسی محلے میں شِفٹ کیوں نہیں ہوجاتے؟

لفظ 'اپنے' کسی تیر کی نوک کی طرح معراج کے دل میں پیوست ہوگیا۔ ایک بار قصبے کے ایک سربرآوردہ شخص نے دادا سے کہا تھا۔ آپ خود نہیں جاتے نہ جایئے۔ شمائل میاں کو تو ضرور اپنے ملک بھیج دیجیے۔ آپ کا کیا بوڑھے ٹھوڑے ...... ان کی زندگی کیوں خطرے میں ڈالتے ہیں۔ دادامرنے مارنے پر تُل گئے تھے۔ یہ اپنے ملک کیوں کہا رام چندر بابو نے ...... لیکن جے پرکاش کا لہجہ اس کے خلوص کا مظہر تھا۔ معراج کے لیے مرنے مارنے کی گنجائش نہیں تھی۔

''یہ میرا محلّہ نہیں ہے؟ اپنے ہی ملک کی زمین کے اس حصے پر میرا حق نہیں ہے؟ وہ حصہ۔ جو میرے نام رجسٹرڈ بھی ہے۔ جس پر میرے نام سے میری کمائی سے مکان بن کر کھڑا ہوا ہے؟''

دادا نے بھی تو ایسا ہی کچھ کہا تھا...... شاید اس سے کہیں زیادہ تُند تلخ الفاظ میں۔

لمحے بھر کو جے پرکاش خاموش ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کی لکیریں تھیں۔

پھر اس نے کہا تھا۔ معراج یہ علاقہ اچانک بہت حساس ہوگیا تھا۔ اور یہاں تم لوگوں کو صرف دو چار ہی گھر ہیں۔ میرا خیال ہے تحفظ سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ جان پر آنچ ہے تو سارا آئیڈیلزم دھرا رہ جاتا ہے۔ اشفاق صاحب کا مکان تقریباً بِک چکا ہے۔ انڈین فینسی اسٹور کے مالک دوسری جگہ منتقل ہوگئے ہیں گرچہ شوروم ابھی یہیں ہے۔ سوچ لو۔ میرے ذہن میں تمہارا تحفظ ہے۔

میں کہاں محفوظ ہوں جے پرکاش؛ کس جگہ جو جگہیں میرا علاقہ کہلائیں گی وہاں پولیس

دروازے توڑ توڑ کر اندر گھسی اور بے قصور لوگوں کو پکڑ پکڑ کے لے گئی۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کا پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں گئے۔

جے پرکاش نے ایک اضطراری حرکت کے تحت سر کھجایا۔ یہ کالونی ایک مخصوص فکر کے لوگوں کا اسٹرانگ ہولڈ بن گئی ہے معراج۔ تم نے جو کہا وہ ایک بھیانک حقیقت ہے لیکن روز دن کا یہ تناؤ۔ آج درگاپوجا کل ہولی۔ پرسوں رام نومی۔ اور اب تو یہ خوبصورت پرسکون تہوار دیوالی بھی۔ کم از کم چھوٹے موٹے موقعوں پر تو جان ضیق میں نہیں ہوگی۔ اور معراج تم، شاہدہ بھابی، زریں اور شہاب۔ تم سب مجھے بہت عزیز ہو۔

یہ بڑے ابا بات کر رہے ہیں۔ دادا سے یا جے پرکاش مجھ سے۔ اور یہ ۱۹۹۴ء ہے یا ۱۹۴۷ء؟ میں کون ہوں؟ معراج کو اس سوال نے پریشان کر رکھا تھا۔ اور میں کہاں ہوں؟ اس سوال نے بھی۔

اس بار دیوالی میں شہاب اور زریں نے نہ موم بتیاں خریدی تھی نہ پٹاخے۔ وہ کالونی میں اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ خوب پٹاخے چھڑاتے تھے۔ شہاب کو ڈرائنگ بہت اچھی آتی تھی۔ شرما جی کے دروازے پر رنگولی وہی بنایا کرتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ پٹاخے چھوٹے تو زریں نے سہم کر شاہدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ یخ ہو رہے تھے۔

مما۔ ہمیں آوازوں سے ڈر لگ رہا ہے۔ دسہرے سے لے کر دیوالی تک چلنے والی فضا میں گھلی تہواروں کی مسرت ایک گہری اداسی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

مسلسل شب بیداری سے تھکے ہوئے معراج نے آخر علی میاں کو بلوا بھیجا۔

پیچ در پیچ گلیوں کے درمیان مرغیاں گھورے پر دانہ چگ رہی تھیں۔ رہائشی مکانوں کے نچلے حصے زیادہ تر دوکانوں کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک میں نانبائی کی دوکان بھی تھی ایک شخص جھپا جھپ تندور میں روٹیاں لگا رہا تھا۔ سیخوں میں کباب پروئے ہوئے تھے جن کی تیز اشتہا انگیز خوشبو پوری گلی میں پھیلی ہوئی تھی۔ گوشت کی دوکان پر ایک سالم بکرا لوہے کے ہک سے لٹک رہا تھا۔ قصاب چھیچھڑوں، چربی اور گوشت کے ناقص ٹکڑوں کو کھٹا کھٹ قیمے میں تبدیل کر رہا تھا۔ ایک آٹو رکشا شاہدہ کو تقریباً چھوتا ہوا ہڑ ہڑ کرتا پاس سے گذر گیا۔ گلی کے موڑ پر اچانک اس کے بریک چیخے اور نکڑ پر بیٹھے تاش کھیلتے بے فکروں میں سے کوئی چلّایا...... اماں کون

تھا یار؟ کتا ، بچہ ، مرغا؟ اور باقی سب ہو ہو کر کے ہنس پڑے۔
ایک نے شاہدہ کی طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈالی پھر ذرا زور سے اپنے ساتھی سے بولا۔ یار یہ میم صاحب یہاں کیا کر رہی ہیں؟ ساتھی نے اسی قدر اونچی آواز میں کہا'' آئی ہوں گی کا ،کھا، گا، گھا، سکھانے یا یہ کہنے کہ بیوی کے پاس جایئے تو کنڈوم ضرور رکھ لیجئے گا۔'' ایک اور قہقہہ بلند ہوا۔

''اب کی فساد میں کالونی والوں کا بخار چھوٹ گیا۔ساری صاحبیت نکل گئی۔دھڑ ادھڑ ہمارے گندے محلے کی زینت بڑھا رہے ہیں'' ایک داڑھی والے صاحب نے کہا جو نپواڑی کے کھو کھے سے ملی دوکان پر بیٹھے بالائی ڈلوا کر چائے سُڑپ رہے تھے اور ساتھ ساتھ ایک لوکل اردو اخبار پڑھتے جا رہے تھے۔ان کے بولنے کا ڈھنگ کچھ ایسا تھا جیسے وہ جملے بھی اخبار میں چھپے رہے ہوں۔

جی ہاں۔معراج کا جی چاہا وہ رُک کر لقمہ دے کہ اس کے ساتھ ہی ملّی ہمدردی وقومی یگانگت کا راگ الاپنے والوں کا بخار بھی چھوٹ گیا۔مسلم محلوں میں مکانوں کے کرائے دوگنے ہو گئے۔زمین کی قیمت آسمان چھونے لگی۔ہونہو ملّی ہمدردی! معراج کا نئی کالونی میں بنا نہایت صاف ستھرا کشادہ مکان اٹھ رہا ہے ڈھائی ہزار روپے ماہوار میں اور یہاں اس بدبودار گھیٹو (Gheto) میں اسے تنگ اور چھوٹا مکان مل رہا ہے تین ہزار میں۔ پھر یہ کہ تمام آسائشیں قربان کر کے پائی پائی کر کے پیسہ جوڑ کر بنایا ہوا مکان صرف اس لیے چھوڑنا کہ ہم ایک مخصوص فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے ہی ہم وطنوں میں غیر محفوظ ہیں۔اوپر سے طرہ یہاں کی مقامی سیاست۔ سُنا ہے اب کی عید میں چاند کا اعلان کرنے والے اہل حدیث کو لوگوں نے پکڑ کر پیٹا۔دو مسلمان بچیوں پر بالٹی بھر کوڑا اُلٹ دیا اس لیے کہ جو دوپٹہ وہ اوڑھے ہوئے تھیں وہ ٹھیک سے ان کے سینے پر پھیلا ہوا نہیں تھا۔بڑے ابا نہ دادا کو قائل کر سکے نہ ابا کو۔یہ لوگ جہاں تھے وہیں جمے بیٹھے رہے لعنت ہے میرے اوپر۔لیکن کیا جے پر کاش نے ٹھیک نہیں کہا تھا کہ تحفظ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔آخر وہ کھانا بھی جب ہی کھائے گا جب زندہ رہے گا اور سر پر چھت بھی تبھی ڈالے گا جب زندہ رہے گا۔شاید اسی لیے شاہدہ نے انتہائی اضمحلال کے باوجود ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا......
یہاں کم از کم ہم خوف کے سایوں سے تو دُور رہ سکیں گے۔

اور اسی لیے اس وقت ٹرک سارے سامان کو یوں نگل گیا تھا جیسے المیے خاندانوں کو نگل جایا کرتے ہیں اور بڑی چچی کی بے چین روح پلٹ کر اس لق و دق آنگن میں آ کر نیم کی شاخ توڑ کر کہہ رہی تھی کہ ان کے آنگن کے (کڑوے) نیم سے بڑی میٹھی خوشبو آتی ہے اور پیارے لال کی بی بی پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

کار میں بیٹھتے بیٹھتے شاہدہ پلٹ کر آئی اور جے پرکاش کی بیوی کو دوبارہ الوداع کہا۔ نم آنکھوں کے ساتھ کئی بار کا دوہرایا ہوا جملہ اس نے پھر دوہرایا۔ ''بھابی، بھول مت جائیے گا۔ وہاں ملنے ضرور آیئے گا۔'' ''ضرور آئیں گے۔'' سُدھا نے یقین دلایا اور شاہدہ کی پیٹھ پھرتے ہی دھیرے سے پھسپھسا کر جے پرکاش سے پوچھا...... ''وہاں جانے میں کوئی ڈر تو نہیں ہوگا نہ؟'' کہتے ہی اس نے دانتوں تلے انگلی دبائی اس لیے کہ شاہدہ کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گذر گیا تھا۔ اس کے دل پر جیسے کسی نے برف کی بھاری سِل رکھ دی تھی اور اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

اُن کی عید

منیر میاں نے حسبِ دستور مشینی انداز میں وضو کیا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھے۔ جسم جیسے گیلا آٹا ہو رہا تھا، جدھر جھکو اُدھر ڈھلک جائے۔ ''آتا ہوں نیک بخت'' انہوں نے بیوی سے کہا، جو پچھلے دو سال میں بیس برس کا سفر طے کر چکی تھیں۔ ہاتھوں میں رعشہ اور نظر کم زور۔ وہ بھی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر شوہر کے پیچھے کواڑ بند کرنے کو اٹھیں۔

منیر میاں محلّے کی مسجد کی طرف نکل گئے۔ برآمدے میں لوہے کے ہُک سے ٹنگے پنجرے میں قید مٹھو چلایا ''دروازہ بند کرو۔ دروازہ بند کرو۔'' پھر بڑی میٹھی آواز میں بولا ''اماں آں۔''

کانپتے ہاتھوں سے ساجدہ بیگم نے دروازہ بند کیا۔ کافی دن کے علاج کے بعد اب بدن کی کپکپاہٹ کم ہو گئی تھی، لیکن انگلیاں پھر بھی قابو میں نہیں رہتی تھیں۔ خاص طور سے جب منیر میاں باہر جاتے اور وہ پیچھے سے کواڑ لگاتیں۔ کیا بند دروازے تحفظ کی گارنٹی ہیں؟ وہ کواڑ توڑ نہ دیں گے؟ وہ، جو کواڑ توڑ دیتے ہیں۔

''اماں — آں۔'' یہ تو مٹھو ہے۔ صرف مٹھو۔ پھر وہ کیوں چونکیں؟ ایسے جیسے معصوم بچّہ ماں کی چھاتی مونہہ میں لئے لئے چونک جائے۔ کواڑ بند ہیں۔ نمازی نماز میں مصروف ہیں۔ فضا خاموش ہے۔ دسویں رمضان کے چاند میں چمک بڑھ چلی ہے۔ سب طرف خیریت ہے۔ ان کے دِل میں بھی۔ اور بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

''اب کی عید دیکھیے، تین کو پڑتی ہے یا چار کو۔'' باسط اشام کو افطار پر چلا آیا تھا۔

کیا فرق پڑتا ہے۔ کبھی پڑے۔ ہر روز روزِ عاشور ہے۔ فرات کے کنارے ٹھاٹیں مارتے پانی سے چند قدم دُور العطش، العطش کی صدائیں۔ سُنا ہے زخم کھانے والے پانی مانگتے ہیں۔ زخم لگیں تو پیاس بھی لگتی ہے۔ اس کے سارے جسم پر زخم ہی زخم تھے۔ اسے کسی نے پانی دیا تھا؟

منیر میاں نے باسط کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اذان کی آواز بلند ہوئی۔ ''لو میاں روزہ کھولو۔'' انہوں نے قدرے شرمندگی کے ساتھ پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ چند کھجوریں تھیں اور ایک طشتری میں اُبلے ہوئے کابلی چنے۔ سُوجی کا حلوہ البتہ کٹورا بھر کر تھا، جو باسط کے آ نکلنے پر جلدی جلدی تیار کر لیا گیا تھا۔ ایسے ہی موقعوں کے لیے ساجدہ چچی کچھ جلد تیار ہو جانے والی چیزوں کا انتظام رکھتی تھیں کہ شاید کوئی آ نکلے۔

''بیٹا۔ ہم لوگ کھجور سے روزہ کھول کر نماز پڑھتے ہیں، پھر سیدھے ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ تم ذرا پہلے آتے تو افطاری تیار ہو جاتی۔ اب نماز پڑھ آؤ، پھر کھانا کھا کے ہی جانا۔ جو بھی ہے دال دَلیہ۔ بیٹا اب کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے نہ پکانے کو۔''

''حلوا بہت سا ہے چچی۔'' باسط نے جلدی سے کہا۔ ''مزے دار بھی ہے۔ اور کھانا تو میں تراویح کے بعد کھاتا ہوں، اس لیے آپ کھانے کی فکر نہ کریں آپ لوگ اپنے معمول کے مطابق کھا لیجیے گا۔''

دونوں خاموشی سے باسط کے حلوا ختم کرنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔

''چچا، تھوڑا سا آپ بھی تو لیجیے۔'' باسط نے پیالہ منیر میاں کی طرف بڑھایا۔ ایسا لگا جیسے وہ میزبان ہے اور منیر میاں مہمان۔

''نہیں بیٹا۔ نہیں ہضم ہوگا۔'' انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

باسط خاموشی سے مونہہ چلاتا رہا۔ صرف تین سال پہلے لانبے، مضبوط منیر چچا کٹوا بھر تر اتا حلوا کھا کر ایک بڑا گلاس دودھ پیا کرتے تھے اور اپنی عمر سے دس برس کم نظر آتے تھے۔ مگر اب کسی پُرانی حویلی کی دیواروں کی طرح ڈھے گئے ہیں منیر چچا۔ باسط بمبئی گیا تھا تو ان لوگوں کا مہمان بنا تھا۔ بڑی خیر ہوئی جو وہ فسادات سے پہلے واپس آ گیا تھا۔ لیکن ظفر ماموں اتنے خوش

قسمت نہیں تھے۔ ظفر ماموں جو باسط کے سگے ماموں ہوتے تھے اور ساجدہ چچی کے خالہ زاد بھائی۔ ہنس مُکھ، محنتی۔ ان کی پرچون کی دُکان تھی۔ مزے میں کھا کما رہے تھے۔ موت نے چپکے سے کان میں کہا: دُکان میں ریڈی میڈ کپڑوں کا کاؤنٹر بھی کھول لو۔ بہت منافع ہوگا۔ وہ مشورہ مان کر منیر چچا کے پاس پہنچ گئے بمبئی۔ اُدھر فضا گرم ہونے لگی تھی اور دُھول اُٹھ رہی تھی۔ چھ دسمبر کو سُورماؤں نے اپنا غصہ اینٹ پتھر کی بے جان پانچ سو سالہ پُرانی عمارت پر اُتارا۔ پھر ظفر ماموں، اجودھیا سے سیکڑوں میل دُور روزی روٹی کی تلاش میں نکلے ہوئے ظفر ماموں، دو جوان ہوتی ہوئی بیٹیوں اور دو بڑھتے بیٹوں کے باپ، والدین کی دھندلاتی آنکھوں کے تارے۔ نہتے اور بے قصور ذبح کر دیئے گئے۔

ظفر کس کی راہ میں ذبح کیا گیا؟ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا نہیں تھا کہ اس کی قربانی اللہ کو منظور ہوتی۔ ظفر کسی فوج میں نہیں لڑ رہا تھا کہ دشمن کے سپاہی اُسے قتل کرتے۔ ظفر کسی ایسے جُرم میں ملوث نہیں تھا کہ قانون اسے موت کی سزا سناتا۔ ظفر کسی کے خون کا قصاص بھی نہیں تھا۔ ظفر کا مِیر باقی سے کوئی رشتہ تھا یا اس کے خاندان کا کوئی شخص باہر سے تعلق رکھتا تھا، اس کے امکانات بھی نہیں تھے۔ لیکن ساجدہ چچی بہت پڑھی لکھی نہیں تھیں اور میر باقی کا تو انہوں نے نام تک نہیں سُنا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک تو وہ بابری مسجد کو بھی نہیں جانتی تھیں۔ اس لیے وہ اتنے سارے الفاظ نہیں استعمال کر سکتی تھیں۔ وہ تو صرف حیران و پریشان کھڑی کفِ افسوس ملتی رہیں اور بھائی کے غم میں ان کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اب وہ بھاوج سے کِس منہ سے ملیں گی۔ صبح تک تو ظفر بالکل ٹھیک تھا۔ ہنا کٹا، خوش مزاج اور صحت مند۔ ہاں، مسجد ٹوٹنے کی بات عام ہوئی تو اس کی آنکھوں میں ایک سُلگی سُلگی سی کیفیت ضرور بیدار ہوئی تھی۔ اس نے بازو پر سیاہ پٹی باندھی تھی۔ بس۔ لیکن کیا اپنے کسی نقصان پر رنج کے اظہار کی سزا موت ہوا کرتی ہے؟ کون سے قانون کے مطابق؟ کس جنگل کا قانون تھا یہ اور کِس نے اشرف المخلوقات کو یہ قانون سکھایا تھا؟ ساجدہ بیگم کو نہیں معلوم تھا کہ جنگل کے زیادہ بے رحم قانون ابھی ان کے منتظر ہیں۔

''بیٹا، اٹھو۔ مغرب کی نماز کا وقت بڑا مختصر ہوتا ہے۔'' منیر چچا نے باسط سے کہا۔

''اور زندگی کا بھی۔ صرف دُکھوں کی کالی رات طویل ہوتی ہے۔'' باسط نے جلدی سے حلوے کا آخری چمچہ منہ میں ڈالا۔

ساجدہ چچی نے دھیمی آنچ پر چائے کا پانی رکھ دیا اور خود بھی نماز کے لیے سر پر دوپٹہ درست کرنے لگیں۔ دونوں نماز پڑھ کر آئیں گے تو وہ چائے کی کشتی حاضر کریں گی۔ بس ایک چائے تھی جو برقرار رہ گئی تھی۔ باقی سارے شوق میاں بیوی نے ترک کر دئے تھے۔ ساجدہ چچی نے پان تک چھوڑ دیا تھا۔

منیر میاں اور باسط لپ جھپ مسجد کی طرف چلے جو بالکل قریب ہی تھی۔ سلام پھیرتے وقت دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ باسط اسی لیے ان کے یہاں آنے سے کتراتا تھا۔ جب بھی مِلو ایسا گہرا اضمحلال طاری ہو جاتا تھا کہ دو چار دن کسی کام میں جی نہ لگے۔ ایسی بے چارگی تھی منیر میاں کے چہرے پر۔ باسط کے دل میں ہولناک خیالات اٹھنے لگے۔ خدا کے حضور میں جھکے یہ سر کیا صرف اِس لیے تہہ تیغ کر دئے جائیں گے کہ وہ ایک مخصوص سمت کی طرف منہ کر کے خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں؟ چوڑے شانوں والا، محبوب عالم گھڑی ساز، زردوزی کا چھوٹا سا کارخانہ چلانے والا سراج، اٹھارہ سالہ کھلنڈرا ابی — کیا یہ سب مار دئے جائیں گے؟ کیا ان کے چہرے پتھروں سے کچل دئے جائیں گے کہ ان کی شناخت نہ ہو سکے، جیسے فسادات کے دوسرے دور میں ذی شان......

لاحول ولا قوۃ! باسط، تم نے تو فساد جھیلا بھی نہیں۔ زندہ سلامت ہو۔ تب بھی تمہارا دماغ یوں خراب ہو رہا ہے۔ خاموش کل جِھبے! کیوں کالی باتیں سوچ رہے ہو؟

رات کالی ہے۔ دن میں سورج چھپا چھپا سا رہتا ہے اور تاتاریوں کے غول حرکت میں ہیں۔

ان سب کو اچھا رکھیو اللہ تعالیٰ — باسط نے لرز کر سوچا اور دُعا کی: اور بنی نوع انسان کو عقل دیجیو اللہ تعالیٰ جو تم نے آج تک نہ دی، اگرچہ اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔

منیر چچا کی پیشانی پر سیہ گٹہ چمک رہا تھا۔ انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دئے تھے اور ہل ہل کر قلب کی انتہائی گہرائیوں سے دعا مانگ رہے تھے۔ لیکن اب انہیں کیا مانگنا تھا اللہ سے کیا ذی شان اور نورین کی مغفرت کی دعا مانگ رہے تھے وہ؟ جس لڑکے کو گھر سے گھسیٹ کر باہر نکالا جائے اور پھر پتھروں سے کچل کچل کر ہلاک کر دیا جائے، کیا اس کے کسی گناہ کی سزا باقی رہ جاتی ہے جو اس کے لیے مغفرت کی دُعا کی جائے؟ اور نورین — باسط تیز ہَوا میں کسی لُنڈ مُنڈ

درخت پر لگے واحد پتّے کی طرح کانپا۔ اُسے ایسا لگا جیسے اس کی آنتیں منھ کو آ رہی ہیں اور اس کا کھایا پیا سب وہیں باہر آ جائے گا۔ نورین کو وہ اٹھا لے گئے تھے۔

''اللہ!'' منیر چچا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھے۔

اللہ پر منیر چچا کا یقین کیسے باقی ہے؟ نمک کی ڈلی کی طرح گُھلنے والے منیر چچا یہ سوچ کر کہ وہ کیوں زندہ بچے، پَل پَل مرنے والے منیر چچا۔ انہوں نے باسط کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

''چلو بیٹا، چائے پی لو۔ اور پھر واپس اپنے گھر جانا۔ تمہاری چچی چائے لے کر بیٹھی ہوں گی۔''

باسط خاموشی سے ساتھ چلنے لگا۔

''بچوں کے کپڑے لتّے بنوا لئے؟'' منیر چچا نے سوال کیا۔

''جی۔'' کہتے ہوئے باسط کو جیسے گناہ کا احساس ہوا۔ وہ کیوں خوش ہے؟ خوشیوں پر اس کا کیا حق ہے؟

''شمشاد کو ہم لوگوں نے اس کی خالہ کے گھر بھیج دیا ہے۔ وہاں اس کی عمر کے بچے ہیں۔'' منیر میاں نے کم زور آواز میں کہا۔

''معلوم ہے چچا۔'' باسط نے مختصر سا جواب دیا۔

شمشاد منیر چچا کا دس سالہ پوتا ہے۔ ذی شان اور نورین کا بچہ۔ بلکہ بچا ہوا بچہ۔ اس نے اپنے باپ کو بلوائیوں کے ہاتھوں گھسیٹے جاتے دیکھا۔ اپنی نوجوان ماں کی کربناک چیخیں سنیں۔ اپنے سولہ سالہ بھائی کو پولیس کے ہاتھوں انتہائی بے رحمی سے پٹتے دیکھا۔ پھر یہ تینوں کبھی واپس نہیں آئے؟

زندگی نے دُھول، مٹی، آگ، دھوئیں اور خون میں لوٹ لگائی اور جب وہ پلٹی تو اس کا چہرہ مختلف ہو چکا تھا۔ کسی دیوانی چڑیل کا چہرہ یا قبرستان کا چہرہ جہاں سنّاٹا ہوتا ہے، اور وحشت اور عبرت ہوتی ہے اور عید محرم کا سماں پیش کرتی ہے۔

العطش، العطش۔ یہ گلا کیوں سُوکھتا ہے اتنا؟ کیا بدلے کی آگ سے جو سینوں میں دہک رہی ہے؟ مستقبل کے خوف سے جو عدم تحفظ کا احساس جگاتا ہے؟

منیر چچا نے اپنی چھوٹی سی بیکری بیچ دی تھی۔ وہ اب وہاں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ان خوف ناک یادوں کے بیچ اور پھر ان دھمکیوں کے درمیان جو فساد ختم ہو جانے کے بہت بعد تک

انہیں ملتی رہی تھیں۔ کوئی مسلمان وہ بیکری خریدنے کو تیار نہیں تھا، اس لیے کہ وہ غیر مُسلم علاقے میں تھی۔ اور وہ جو پہلے قطعی بے ضرر تھے، اب سارے کے سارے ضرر کی علامت بن چکے تھے اور دلوں میں خوف جگانے لگے تھے۔ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں میں خوف جگانے لگے تھے، اگر چہ زندگی ان سب کے لیے یکساں سُکھ دُکھ سے عبارت تھی۔ یکساں سُکھ دُکھ اور یکساں سُو دوزیاں۔ اور ان سب کی رگوں میں بہنے والا لہو بھی ایک جیسا ہی تھا۔ پھر بھی ان میں سے کچھ، دوسروں کے لیے ضرر کی علامت تھے۔ اور جو کچھ ہو رہا تھا یا ہوا تھا، ہونا نہیں چاہئے تھا۔

بیکری نہایت اونے پونے فروخت ہوئی اپنے وطن واپس آ کر منیر میاں نے یہ ٹوٹا پھوٹا بے رونق مکان خریدا۔ اس سے بہتر کی نہ اُن کی استطاعت تھی، نہ خواہش۔ باقی رد پوں سے انہوں نے چھوٹی سی پرچون کی دکان کھولی۔ شمشاد ان کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔ اُسے پروان چڑھانا تھا۔ جب تک زندہ تھے، پیٹ میں کچھ ڈالنا تھا اور ظفر کے کُنبے کو بھی دیکھنا تھا۔ برسہا برس سے روشنیوں اور کنکریٹ کے اس دیو قامت شہر میں رہنے کی عادت کے باوجود وہ بغیر کسی پریشانی کے اپنے آبائی قصبے میں رہنے لگے تھے۔

''رہتے تو بیٹا ہم اپنے جسم کی قبر میں ہیں۔ اور ہم کہیں نہیں رہتے۔'' منیر چچا نے سادگی سے کہا تھا۔'' اور اگر جسم قبر بن جائے تو بمبئی کیا اور یہ گاؤں نما قصبہ کیا۔''

پچھلی عید پر، جو یہاں منیر میاں کی پہلی عید تھی، سارے عزیز ان کے گھر ضرور آئے تھے، اور کسی کے گھر گئے ہوں یا نہ گئے ہوں۔ سب کے دل اُداس ہو گئے تھے۔ دونوں میاں بیوی کے سپاٹ چہرے ایسے تھے جیسے کسی گھر کے مقفّل کِواڑ۔ 'ہمارا دُکھ تمہارے ساتھ بانٹنے لائق نہیں ہے، ان مقفّل کواڑوں پر لٹکی تختی پر لکھا تھا، اسے اندر ہی رہنے دو، ورنہ یہ تمہیں سیل بلا کی طرح بہالے جائے گا'۔ انہوں نے دل کے کواڑ مقفّل رکھے، پھر بھی لوگ اداس ہوئے اور منور آپا تو ساجدہ چچی سے لپٹ کر اتنا روئیں کہ بے ہوش ہو گئیں۔ دراصل ان کا جوان داماد اُن ہی دنوں کافی عرصہ بیمار رہ کر مَر گیا تھا۔ بڑا ہی نیک اور بیوی بچوں سے محبت کرنے والا انسان تھا۔ گھریلو اور محنتی۔ اچھا کماتا تھا اور دِل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ مبارک ہیں وہ جو چین سے مَرتے ہیں۔ بند کواڑوں کے اندر سے باہر لے جائے جا کر، بے خطا، بے قصور سنگسار نہیں کئے جاتے۔ مگر ساجدہ چچی نے کہا کچھ نہیں۔ خاموش رہیں۔ ان کا دُکھ سمندر تھا جو دوسروں کے دُکھ کی ندیوں کو اپنے اندر خاموشی

سے سمیٹ لیتا تھا۔ سمندر گہرا ہوتا ہے اور سمندر میں کبھی سیلاب نہیں آتا۔ صرف اندر ہی اندر دھارے چلتے ہیں، سرد بھی اور گرم بھی۔

باسط کو ان لوگوں سے بے حد ہمدردی تھی، لیکن وہ عید کے دن وہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ گھر پر ہُو کا عالم۔ ایک قبل از وقت بوڑھا ہو جانے والا مرد اور ایک قبل از وقت بوڑھی ہو جانے والی عورت، جس کے چہرے پر بے چارگی پُتی ہوئی تھی اور آنکھیں لبالب کٹورے۔ برآمدے کی کھپریل سے لٹکا مٹھو کا پنجرا۔

''اماں — آں —!''

کس نے پکارا؟ ذی شان نے یا سعادت مند خوش شکل، رُن جُھن پائل بجاتی بہو نے؟ (یا مظلوم ظفر نے جس کا اس عفریت نما شہر سے کوئی واسطہ یا مطلب ہی نہ تھا۔ وہ وہاں صرف مرنے آیا تھا۔) یا کھٹے میٹھے تجربوں سے گزرتی ان کی سابقہ خوش و خرم زندگی نے —؟

کسی نے بھی نہیں۔ یہ تو مٹھو ہے، جو بے سوچے سمجھے بولتا ہے۔

ساجدہ چچی نے پھر بھی صاف دُھلا ہوا دسترخوان بچھایا تھا۔

''چچی!'' باسط اور ساتھ آئے ہوئے دو اور عزیزوں کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔

''عید ہے بیٹا۔'' انہوں نے رسان سے کہا تھا۔ ''منہ میٹھا کرو۔ تیوہار کے دن تم کیوں بدشگونوں سے گزرو۔''

پھر وہ دو پیالوں میں سویّاں لائیں، سادی بالکل۔ اُبال کر صرف دودھ، چینی ڈالی ہوئی! اور صرف سویّاں۔ زندگی کی طرح ان کا بھرا پُرا دسترخوان بھی سمٹ چکا تھا۔

لوگوں نے چُپ چاپ سویّاں کھالیں کہ چچی کی دل شکنی نہ ہو۔ پھر وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں۔ طاق پر سے ٹٹول کر سونف کی طشتری اٹھائی۔ ''لو سونف لو۔''

ان لوگوں نے خاموشی سے سونف بھی لے لی۔ تھوڑی دیر یوں ہی بیٹھے رہ کر انہوں نے کہا۔

''اب چلتے ہیں چچی۔''

''اچھا بیٹا۔'' چچی نے جواب دیا۔

باسط اور وہ عزیز رُخصت ہو گئے۔ ان کے باہر نکلنے پر کواڑ کُھلا تو کنڈی دیر تک کھڑکتی

رہی۔

''کون ہے؟ کون ہے؟'' مٹھو نے پنجرے میں چک پھیریاں لگائیں، پھر خود ہی بولا
''کوئی نہیں۔کوئی نہیں۔''

سارے عزیز نماز کے بعد ہی ایک ایک دو دو کر کے آ کے مِل گئے تھے۔اب اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو۔ذی شان کبھی نہیں آئے گا۔نورین کا دَلا ہوا، کٹا پھٹا جسم تک نہیں ملے گا اوران کے بڑے بیٹے نوشاد کا بھی نہیں۔اور ظفر بھی وہیں گیا ہے۔وہ بھی نہیں آئے گا۔مگر تم کیوں رنجیدہ ہوتے ہو؟ منیر میاں وہ تو بہت سے تھے جو یوں مارے گئے۔عید تم اکیلے کی تو نہیں۔ان سارے گھروں میں ایسی ہی عید ہے۔مہندی، عطر، پان، سوئیوں، مٹھاس اور مسرّتوں سے عاری۔بے رنگ ونور۔

دھوپ چھوٹے سے کچے آنگن میں لگے امرود کے درخت کی پھُنگ سے ہوتی ہوئی دیوار پر چڑھ چکی تھی۔ پانچ بج رہے ہوں گے۔ساجدہ بی بی نے عصر کی نماز کے لیے وضو کرنا شروع کر دیا تھا۔صبح نورین کے رشتے کے خالو وصی احمد بھی آئے تھے۔ساتھ میں بچّے بھی تھے۔ کہہ گئے تھے کہ ان کی اماں نہیں آسکیں۔کل آئیں گی۔آج فرصت نہیں ملے گی۔

''تیوہار کے دن عورتوں کو کہاں فرصت؟'' ساجدہ بی بی نے صِدق دِلی سے کہا۔خدا نہ کرے جو کسی کو عید کے دن ایسی فرصت ملے۔انہوں نے مسح کے لیے بالوں میں انگلیاں پھیریں، وضو مکمل کیا اور جھکی جھکی سی اُٹھنے لگیں۔اللہ—— پھر انہوں نے عصر کے بعد مغرب کی نماز پڑھی اور پھر عشا کی۔عید ختم ہوئی۔کسی بھی عام دن کی طرح وہ عید کا دن تھا۔پھر بھی اس میں کوئی خاص بات نہیں ہوسکی تھی۔وہ ویسا ہی دن تھا جیسا اب گزرنے والا کوئی بھی دن۔بے کراں، اُداس اور بے حساب اُجاڑ۔دِل کے ریگستان میں آگ برساتی ہوائیں چکراتی پھرتی تھیں اور چہرے کے کواڑ مقفل تھے۔

منیر چچا کے ساتھ چلتا ہوا باسط سوچ رہا تھا کہ اس بار عید پر ان کے یہاں لوگ شاید پچھلی بار سے کم آئیں پچھلی بار ان کی پہلی عید تھی۔خود باسط دو بار رمضان میں آچکا ہے۔آج اُن کے ساتھ افطار بھی کرلیا ہے۔اگر عید میں نہ آسکا تو ایسی کوئی شکایت کی بات نہیں ہوگی۔وہ بے رحمی نہیں برت رہا ہے۔نہ ہی طوطا چشمی۔وہ اپنے اندر کی اس بے کلی سے بچنا چاہتا ہے جو اُن کی عید

میں شریک ہو کر اسے ملتی ہے۔ عید جو جاڑوں میں ہلکے بادلوں سے چھن کر آتی اُداس، مریل دھوپ کی طرح اُن کے آنگن میں اُترتی ہے اور شام ہونے سے پہلے دبے پاؤں رخصت ہو جاتی ہے اور رات کو سونے سے پہلے وہ دعا کرتے ہیں کہ صبح کو ان کی آنکھیں نہ کھلیں تو کتنا اچھا ہو۔ دنیا کا کیا ہے۔ دنیا تو یوں ہی رواں دواں رہے گی۔

شانو کا سوال

تو بٹیا نیل گری کی پہاڑیوں میں ایک راکشس رہا کرتا تھا۔ اپو کی دادی نے کئی بار کی دوہرائی ہوئی کہانی شروع کی۔ اپو کی دادی سارے محلے کی دادی تھیں۔ اپو کے ساتھ شانو کا بچپن بھی ان کی گود میں گھس کر گزر رہا تھا۔ اس کی اپنی دادی تو بالکل کٹ کھنی تھیں۔ کہانی کے نام پر اپنا لمبا سا ڈنڈا اُٹھا لیتی تھیں — ''نہ بھئی، دادی اماں کوئی اور کہانی سنائیے۔ یہ تو سُن چکے۔'' شانو ہنہنائی۔ ''کہاں سے لاؤں روز روز نئی کہانی ؟ چھل پیر یو۔ سُننا ہے تو سُنو، نہیں تو بھاگو۔'' دادی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ پھر وہ رسان سے بولیں۔ ''جتنی کہانیاں مجھے آتی ہیں، ان میں اس سے اچھی کوئی اور کہانی نہیں ہے بیٹا۔''

اپو بے صبری سے بولی۔ ''ہاں دادی۔'' اسے ڈر تھا کہیں یہ کہانی بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ دراصل باہر کے سارے ایڈونچر ختم ہو چکے تھے۔ کچے آم کھائے جا چکے تھے۔ تتلیاں پکڑی جا چکی تھیں۔ رام بھروسے کی مُرغیوں پر پتھر پھینک پھینک کر اُنہیں عاجز کیا جا چکا تھا۔ اب صرف دادی کو تنگ کر کے کہانی سننا باقی رہ گیا تھا۔

......''ہاں تو بٹیا اب راکشس کو بردان تھا کہ وہ کبھی مرے گا نہیں۔''

''دادی، ایسا بردان کس نے دیا تھا؟''

''ارے دیا ہوگا کسی دیوی دیوتا نے۔ اب تُو کہانی سُن رہی ہے کہ جرح کر رہی ہے وکیلوں کی طرح۔''

شانو جلدی سے اپّو کی بغل میں دبک گئی۔ ارے باپ رے۔ دادی ناراض ہو گئیں تو کہانی درمیان میں رہ جائے گی۔ جو کہانیاں سمجھ میں نہ آئیں وہ بھی دادی کے منہ سے بڑی اچھی لگتی ہیں۔ صدیاں گزر گئیں اور وہ راکشس جیتے جیتے عاجز آ گیا۔ زندگی سے اُس کا دل بھر چکا تھا۔

''جیتے جیتے بھی کوئی عاجز آ جاتا ہے۔'' گیارہ بارہ سالہ شانو گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ دنیا کتنی حسین ہے رنگ برنگی پھولوں بھری۔ آم کے درختوں، امرود کے باغوں، کھٹّی میٹھی املیوں اور پانچ پیسے میں دس چینی کی گولیوں والی دنیا۔ بھولا کی دوکان جہاں میٹھی گولیوں کے علاوہ چورن بھی ملتا ہے۔ اماں کی نرم نرم گودی، اپّو کی دادی کی کہانیاں —— چیتھڑوں کی گڑیاں، گلی میں آنکھ مچولی، لپاڈگی۔

——''خیر تو دادی پھر کیا ہوا؟''

تو اس نے ایک دن پہاڑ سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ وہ جیسے ہی نیچے کُودا، زمین اُٹھ کر اُس کے پیروں تلے آ گئی۔ اُسے بردان جو ملا تھا۔

'ہاہا۔ ہا۔ زمین کیسے اُٹھی دادی اماں۔ بڑا سا گوبڑ نکل آیا ہو گا وہاں پر۔ جیسے بلّی انگڑائی لینے میں نکالتی ہے۔ اپّو کھی کھی کر کے ہنسنے لگی—— یہ اپو ہمیشہ کہانی کا ستیاناس کرنے پر تُلی رہتی ہے۔ شانو نے اسے گھورا۔ ہاں تو دادی ماں؟

پھر وہ راکشس آگ میں کُودا۔ آگ اس کو چھوتے ہی بُجھ گئی۔

ایسا ہی کوئی راکشس یہاں رہتا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ پرلے گاؤں میں نہ جانے کس نے آگ لگا دی تھی۔ بے چارے سارے لوگوں کی جھونپڑیاں جل کر ختم ہو گئیں وہ جو آتے تھے عبدالرحیم چاچا، ٹین کے بکسے میں نان ختائیاں اور ڈبل روٹی بھر کر بیچنے، وہ بھی جل گئے۔ اپّو کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ کچھ بولی تو شانو ناراض ہو گی۔

—— پھر راکشس نے سمندر میں چھلانگ لگائی۔ سمندر سُوکھ گیا۔ راکشس بہت رویا۔ ہے بھگوان۔ کس لمحے میں یہ بردان لے لیا تھا، جان کی مصیبت ہو گئی۔

ہم ہوتے تو کبھی نہ اُکتاتے۔ مزے سے جیے جاتے۔ اپّو کو مرنے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ دادا مرے تھے تو لوگ آگ میں جلا آئے تھے۔ شانو کی پھوپھی مری تھیں تو جنگل ویرانے میں

لے جا کر گاڑ دیا گیا۔ اپو کو جھرجھری آئی۔ چاہے جلاؤ چاہے گاڑو—— مرنا ہے مصیبت۔

''شانو—— او شانو'' کوئی زور زور سے پکار رہا تھا۔ الیاس بھائی کی آواز تھی۔ آ گئے مزاغارت کرنے کو۔ یہ تو مر ہی جائیں تو واقعی بڑا اچھا ہو۔ شانو اور اپو دونوں نے اپنی اپنی جگہ سوچا۔ لیکن بائیس سالہ الیاس بھائی نہ صرف زندہ تھے بلکہ اچھے بھلے تندرست بھی تھے۔ اور مستقبل قریب میں ان کے مرنے کی کوئی اُمید بھی نہیں تھی۔ شانو گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کانوں پر الیاس بھائی کی پکڑ بڑی مضبوط اور تکلیف دہ ہوا کرتی تھی۔ نہ اُٹھتی تو وہ سیدھے کانوں پر حملہ کرتے۔

کھانا پڑا سُوکھ رہا ہے اور یہ یہاں گھُسی بیٹھی ہے۔ چل جلدی وہ غرّائے۔ پھر جلدی سے دادی کی طرف دیکھ کر بولے۔ آداب دادی! کیا ہو رہا تھا؟ تنگ کر رہی تھی یہ شانو؟

نہ بیٹا تنگ کیا کرنا ہے۔ کہانی سُن رہی تھی۔ بڑے دنوں پر اِدھر آئے بیٹا۔ نوکری کی خیر خبر ملی؟

دادی! الیاس بھائی کے لہجے میں احتجاج تھا۔ نوکری کی خیر خبر ملے گی تو آپ کے پاس خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔ یہ تو دادی تھیں۔ کوئی اور پوچھتا تو الیاس بھائی ایسی آگ برساتی نظروں سے دیکھتے کہ اُسی جگہ جل جاتا بے چارہ۔ نوکری الیاس بھائی کی چڑ بن چکی تھی۔

وہ شانو کا ہاتھ تھام کر گلی کی طرف بڑھ گئے۔ بائیں ہاتھ نور جہاں کا گھر تھا۔ امرود کے درخت کی پھنگ دُور سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ اونچی ڈالوں پر پھیلے گدرے امرود نیچی دیوار پھلانگ کر جھانک رہے تھے۔ شانو کی نظریں چپک کر رہ گئیں۔ قدم بھی جیسے دھرتی میں گڑ گئے۔

بھیّا اَمرود! بڑے میٹھے ہوں گے۔

تو کیا ہوا؟ تیری سسرال کے ہیں کیا؟ الیاس بھائی کا انداز کاٹ کھانے والا تھا۔ شانو ڈر گئی۔ بھائی نے ایک نظر دیوار پر ڈالی۔ ایک امرودوں پر—— ٹائر سے بنے موٹے چپلوں کی نوک سے ایک کنکری کو ٹھوکر لگائی پھر شانے جھکا کر ناک کی سیدھ میں چلنے لگے۔ جیسے اِدھر اُدھر دیکھا تو پکڑے جائیں گے۔—— اماں کھانا لیے بیٹھی تھیں ارہر کی دال، روٹی، چاول، آم کا اچار۔ ''کہاں تھی نامراد؟''

اسی اپو کے گھر رہی ہوگی۔ نہ خود پڑھے نہ دوسروں کو پڑھنے دے۔ ہوائی دیدہ۔ دن

بھر گھر سے باہر۔ جیسا بھائی ویسی بہن۔ جب سب سے بڑا ہی آوارہ لفنگا نکلجائے تو چھوٹوں کو کیا کہوں۔'' ان دل خوش کن کلمات کے ساتھ اماں نے کھانا حاضر کیا۔

الیاس بھائی سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ روٹیوں کی چنگیر اپنی طرف کھینچی۔ تام چینی کی پلیٹ سرکائی ایک نوالہ منھ میں ڈالا۔ دال بگھاری نہیں اماں۔ گھی ختم ہو گیا کیا؟ وہ رسان سے بولے۔

'' تمہاری کمائی سے جو گھی آیا تھا وہ میں کھا گئی۔ اپنے باپ بھائی کو بھجوا دیا۔ اب تم نگلو اُبلی دال۔''

شانو کا منھ جلدی جلدی چلنے لگا کہیں اماں یہ نہ سمجھیں کہ وہ بھی دال نہ بگھارنے کا شکوہ کر رہی ہے۔ بے چاری اماں۔ الیاس بھائی نے انہیں ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ کل دادی نے ابا سے نہ جانے کیا لگائی بُجھائی کی تھی کہ وہ دن بھر اماں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے رہے تھے پھر نمک کم ہونے کی شکایت کر کے پلیٹ اٹھا کر پھینکی تو آنگن میں جا کر گری۔ جلدی جلدی کھانا زہر مار کر کے الیاس بھائی بھاگے۔ راستے میں دادی کی پلنگڑی بچھی تھی، جن کی آنکھیں شکرے کی طرح تھیں۔ '' ارے او الیاس! ذرا سروتہ تو اُٹھا دے۔'' اپنے انگڑ کھنگڑ سمیت پھٹی پرانی دادی کوڑے کا ہی ایک حصہ معلوم ہوتی تھیں۔ ٹوٹے ٹھیکرے، چھید والے گھڑے، پھٹی سیون، اُدھڑی کتھریاں — المونیم کا لوٹا جس کی ٹونٹی ٹیڑھی ہوتے ہوتے ٹوٹ گئی تھی۔ ایک نقشین کٹوارا جس کے نقش گھس گئے تھے، زنگ آلود بکس، بکس میں بھری چندھیاں۔ الیاس بھائی کا جی چاہا ایک بڑی سی جھاڑو مل جائے، کسی جن کی جھاڑو اور وہ اس سارے کوڑے کو جھاڑ دیں — دادی سمیت۔ یہ رہا سروتہ۔ الیاس بھائی نے سروتہ ٹپکا۔ اور جلدی سے جان چھڑا کر بھاگنے کی فکر کرنے لگے۔

'' ارے او ڈھینگ، بھاگ کہاں کو رہا ہے۔ بے نتھا بیل۔ بیٹھ تو ذرا یہاں۔''

الیاس بھائی کی جان سوکھ گئی لیکن نہ بیٹھتے تو وہ ابا سے کہتیں۔ اسی مالزادی نجمن نے منع کیا ہوگا میرے پاس بیٹھنے کو اور نجمن یعنی اماں کی پھر شامت آتی۔

'' وہ مجید میاں پھر آئے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ اپنی چائے کی دوکان دیں گے اور بیٹا لڑکی بھی اچھی ہی ہے۔'' دادی کا لہجہ اچانک میٹھا ہو گیا۔ الیاس بھائی کے بدن میں آگ لگ گئی وہ انگوٹھے سے کچی زمین کا ایک چھید کریدنے لگے۔

''بولتا کیوں نہیں؟ سانپ سُونگھ گیا ارے کبھی کچھ کرے گا بھی یا بس مفت کی روٹیاں توڑتا رہے گا۔''

یہ گندی گالی ہزار بار دوہرائے جانے کے باوجود اپنی کاٹ نہیں کھو سکی تھی۔ ''مفت کی روٹیاں۔'' اپنی دادی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنے عزیز، سب مفت کی روٹیوں کا طعنہ دے رہے تھے۔ آج سے چار سال پہلے جب الیاس بھائی نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا تو سب کا خیال تھا کہ نوکری سینی پر لگ کر خود بخود ان کے سامنے چلی آئے گی۔ چار برس کی تگ و دو کے بعد بھی نہیں ملی تو قصور سراسر انہیں کا ٹھہرا ـــــــ

''بس دادی، چار چھ مہینے اور چھوڑ دیجئے مجھے پھر جواب دوں گا۔'' اس سے قبل کہ دادی کی زبان کچھ اور تیزاب اُگلے وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دادی نے سروتہ زور سے ڈلی پر چلایا۔ کٹ حجت، کمینہ، نیچ خاندان، ننہیال والوں پر چلا گیا۔ اُنہوں نے اماں کو سُنا کر کہا۔

الیاس بھائی اپنے سارے سپنے ابھی چائے کی بھٹی میں جلانے کو تیار نہیں تھے۔ شاید جلا دیتے، لیکن اس کے ساتھ وہ لڑکی؟ کوئی ان کے کلیجے میں گھونسا سا مارتا۔

ابا میونسپلٹی میں کلرک تھے۔ پہلے اُنھوں نے بیٹے کو داروغہ یا انٹرمیڈیٹ کالج کا لیکچرر یا کوئی چھوٹا موٹا افسر جیسی چیز بنانے کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن میونسپلٹی کے اسکول میں پڑھنے والے، خاکی زین کی گھِسی ہوئی یونیفارم پہن کر مُرغا بننے اور ماسٹروں کا سودا سلف لانے والے لڑکوں میں اس طرح کے عہدیداروں کا تناسب بہت کم تھا۔ یہاں ذہانت آتی تھی تو کچھ عرصے بعد اس میں خود بخود زنگ لگ جاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد الیاس بھائی کو تعلیم ختم کر دینی پڑی تھی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے غربت بڑھا دی تھی۔ آپا کی شادی کے وقت لیا گیا قرض بھی ادا کرنا تھا۔ اماں اور دادی دونوں آئے دن بیمار رہا کرتی تھیں۔ گھر میں ہر سال ایک مریل سے بچے کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ کچھ بھی ہو انٹرمیڈیٹ کے بعد بابو بنا جا سکتا ہے۔ پھر داروغہ کے لیے بھی گریجویشن ضروری نہیں تھا۔ باہر بھاگتے ہوئے الیاس بھائی نے جیب ٹٹولی۔ چار روپے بچے ہوئے تھے۔ کچھ دن پہلے رام آشرے بابو نے کچھ پرانی دستاویزیں اردو سے ہندی میں ترجمہ کرائی تھیں اور جیب میں دس روپے زبردستی ڈال دیے تھے۔ تھے تو بڑے آدمی لیکن ابا سے پرانی جان پہچان تھی۔ الیاس میاں نے بہت نا نا کی، لیکن دل ہی دل میں ان کی زبردستی سے خوش

ہو گئے ۔دس روپے! ان کے اپنے! کسی بینک سے کلرکی کی جگہ نکلی تھی ۔دو روپے بھیج کر اس کا فارم منگوا لیا۔ دو روپے میں جنرل نالج کی ایک سیکنڈ ہینڈ کتاب خریدی ۔دو روپے میں فٹ پاتھ پر تصویر کھنچوائی ۔فارم میں لگائی تھی ۔چار روپے بچے تو ہیں لیکن الہ آباد تک جانے کا کرایہ؟ کیا پتہ انٹرویو لیٹر آ ہی جائے ۔الہ آباد میں ایک دن رہنا بھی ہوگا۔ایک دن رہنے میں کم از کم چنے تو پھانکنے ہی ہوں گے۔ اُن کے پیسے؟ پچھلے سال ایک جگہ سے انٹرویو لیٹر آیا تھا۔لکھنؤ پہنچے ۔ زبردست مجمع تھا۔اس میں کتنے لوگ ایسے تھے جو ٹیریلین کی بشرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھے۔ چکنے چہروں اور سنورے ہوئے بالوں والے لوگ ہاتھ میں بریف کیس یا ائیر بیگ ۔دھاریدار پاجامہ، ملگجی قمیض پہنے، ہاتھ میں جھولا لیے الیاس بھائی کی گھگھی بندھ گئی ۔اماں نے کتنے جتن سے کپڑے دھوئے تھے۔ بدبودار صابن جو وہ استعمال کرتی تھیں، کی جگہ کسی ڈٹرجنٹ کی پڑیہ منگائی تھی ۔استری بھی کی تھی ۔لیکن کئی گھنٹوں کا سفر، ریل کی بھیڑ، دھکے مکّے ،سُوتی کپڑوں کی بساط ہی کیا۔ الیاس بھائی کو لگا، ہر شخص اُن کو گھور رہا ہے۔ وہ ساری آنکھیں مسکرا رہی ہیں ۔ہمیں تم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہمارا تمہارا کیا مقابلہ۔دو چار ان کی طرح بھی تھے۔ان میں سے ایک نے ان کے قریب آنے کی کوشش کی ۔الیاس بھائی دوسری طرف کو سرک گئے ۔وہ ملگجے پاجاموں والی بھیڑ میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ حالانکہ پتلونیں انہیں منھ لگانے کو تیار نہیں تھیں ۔ یک بیک انہیں خوف نے گھیر لیا۔ جی چاہا بھاگ جائیں ۔پھر انہوں نے ہمّت جوڑی ۔ان کے راستے کے خرچ کے لیے ابا نے مراری سے بیس روپے قرض لیے تھے۔ان سے یہ تجربہ ہی خرید لیں کہ انٹرویو کیسے ہوتا ہے۔نوکری تو قرض لیے ہوئے بیس روپوں میں نہیں بِکا کرتی ۔بے چارے ابا۔الیاس بھائی کے گلے میں گولا سا اٹکا۔

نوکری نہیں ملی ۔ابا نے کہا۔ پڑھتا لکھتا نہیں تھا۔نور جہاں کے گھر کے چکّر لگایا کرتا تھا۔ میں اس چپراسی کو اچھی طرح جانتا ہوں ۔ بیٹی کو آگے بڑھا کر لڑکا ہتھیانا چاہتا ہے۔اپنی اوقات بھول گیا۔مُراری سے لیے گئے روپوں نے گھر کا بجٹ الٹ پلٹ کر دیا تھا۔اماں اُن کا ماتم کرنے لگیں۔

نور جہاں ۔نور جہاں ۔ یہ نام اُبلتے ہوئے ذہن پر ملائم ٹھنڈا آنچل بن کر لہراتا ہے تو تپش ذرا کم ہو جاتی ہے۔ابا اُسے گالی بنا کر کیوں منھ سے نکالتے ہیں ۔الیاس کا دل تڑپ اُٹھا۔

——— ''انہوں نے تڑپ کر گردن گھمائی۔ ایسا لگا جیسے گردن پر کسی اژدہے کی پھنکار پڑی ہو۔ وہ بے حد موٹا مچھش اُنہیں سے مخاطب تھا۔ کالے چہرے پر سونا منڈھے دانت لَو دے رہے تھے۔ الیاس بھائی اسے پہچانتے تھے۔ وہ مخالف پارٹی کے ایک مقامی لیڈر کا کارکن تھا۔ الیکشن کے دنوں میں لوگوں کو گھیر گھار کر اُن کے بُوتھ پر لے جا رہا تھا۔ الیاس کو بھی پکڑ کر لے گیا تھا۔ ووٹ کے بدلے کولہاپوری چپلیں دلوائی تھیں۔ ان دنوں ایک جوڑ چپل الیاس میاں کا بہت بڑا مسئلہ تھے۔ وہ تب اکیس برس کے نہیں تھے۔ ووٹر لسٹ میں ان کا نام نہیں تھا۔ ووٹ کسی اور کے بدلے دیا گیا تھا۔

''کیوں میاں نوکری لگی؟ الیاس نے سر جھکا لیا۔ وہ مچھش سے بہت ڈرتے تھے۔ دادی کا لحاظ کرتے تھے۔ اس لیے غصہ پی گئے تھے۔ مچھش سے ڈرتے تھے اس لیے غصہ پینا پڑا۔ اماں پر رحم کھاتے تھے، اس لیے خاموش رہ گئے۔ سارا غصّہ اندر اندر لہو میں جذب ہوتا رہا۔ لہو اوپر کو چڑھا۔ سَن سَن سَن سَن۔

موٹے کالے شخص نے پھر اپنا سوال دوہرایا— اور جواب کا انتظار کئے بغیر سرکار کو ایک غلیظ گالی بکی۔ الیاس کا سر مزید جھک گیا۔ وہ رازدارانہ انداز میں اُن کی طرف جھکا۔'' پیسے رہئیں؟'' الیاس بھائی ایسے اُچھلے جیسے بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔ پیسے—؟ پیسے؟ پیسے کس کو نہیں چاہئیں؟ مگر کہاں؟ کون بانٹ رہا ہے؟ آہ پیسے! پیڑ پر پھلے ہیں کیا میرے بھائی، الیاس میاں کے اندر کوئی اُچھل کود کرنے لگا۔

''سُنو پیسے چاہئیں تو جو میں کہوں وہ کرنا ہوگا۔ معمولی سا کام ہے۔ تمہارے اوپر آنچ نہیں آئے گی۔ یہ ذمّہ میرا ہے۔'' الیاس بھائی ذرا چوکنے ہوئے۔ کام بتاؤ بھائی۔ میرے کرنے کا ہوگا تو کروں گا۔

——— ''کرنے کا ہوگا تو کروں گا—'' اس شخص نے جیسے منہ چڑایا۔ ہٹا کٹا جوان لونڈا کون سا کام کرنے کا نہیں ہے؟ بے کاری بے کاری کرتے رہو۔ کام بتایا جائے تو مینگ میخ نکالو۔ وہ اطمینان سے پُلیہ سے ٹِک کر بیٹھ گیا۔ جیب سے ایک سگریٹ نکالا اور الیاس بھائی کے چہرے پر دھواں چھوڑتا ہوا بولا۔ ایک پیکٹ ہے پتہ بتادوں گا۔ وہاں پہنچا دینا۔ جس آدمی کو دینا ہوگا اُس کا حُلیہ بھی بتادیا جائے گا۔ ایک بار پہنچانے کے سو روپے ملیں گے۔ اس نے ذرا رُک کر

کلائمکس پیش کیا۔

پندرہ برس پہلے سو روپوں کی بڑی اہمیت تھی الیاس بھائی احمقوں کی طرح منہ پھاڑے دیکھتے رہ گئے۔ لمحہ بھر کو سب کچھ بڑا غیر حقیقی سا معلوم ہوا۔ ''ڈرپوک کہیں کا۔'' اس شخص نے حقارت سے کہا۔ اچھا خیر کرنا ہو کرو۔ نہ کرنا ہو مت کرو۔ لیکن کسی سے اس کے بارے میں کچھ کہا تو ——— اس نے جیب تھپتھپائی اور جملہ ادھورا چھوڑ کر انتہائی بے پروائی سے ایک تہہ کیا ہوا چوڑا چاقو برآمد کیا —— آگے الفاظ کی ضرورت واقعی نہیں تھی۔

دبّو گھسّو، ماں، دادی اور باپ کی عقابی نظروں کے تلے پرورش پائے ہوئے الیاس میاں کی گھگھی بندھ گئی۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ جان بخشی کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ قسم قرآن شریف کی۔ وہ تھرتھراتے ہوئے بھاگ نکلے۔

اس شخص نے زمین پر تھوکا۔ فیصلے میں غلطی ہوگئی۔ اسے اُمید تھی یہ لڑکا کام کرنے لگے گا۔ عرصے سے بے کار تھا مگر وہ تو بڑا بزدل نکلا۔ ادھر کچھ دنوں سے پولیس مچھش کے گروہ کی ٹوہ میں لگ گئی تھی۔ کچھ شک ہو گیا تھا۔ دو ایک کارکن پکڑے بھی گئے تھے۔ گرچہ ثبوت نہ ملنے پر چھوڑ دیے گئے تھے۔ لیکن وہ نئے لڑکوں کو لینا چاہ رہا تھا۔ لڑکے بھی الیاس بھائی جیسے بے ضرر شکل وصورت والے جن پر کسی کو شبہ نہ ہو۔ لڑکا سیدھا ہے کسی سے کچھ کہے گا نہیں۔ یہ اطمینان تھا۔ خیر کبھی بھی تو ایسے کیڑے مکوڑے اس کے لیے پرابلم نہیں ہیں۔ نمٹ لیا جائے گا۔

ایک مہینہ پر لگا کر اُڑ گیا۔ الیاس بھائی بلا وجہ زادِ راہ کی فکر کرتے رہے۔ اس بار اُنہیں انٹرویو میں نہیں بلایا گیا تھا۔ پہلے ہی چھانٹ دیے گئے تھے۔ برسات آچکی تھی۔ کھپریل کا مکان جگہ جگہ سے ٹپ ٹپ کر رہا تھا۔ آپا زچگی کے لیے گھر آئی ہوئی تھیں۔ گھر کی بغل میں جو گڈھا تھا اس میں بڑے ٹرٹر کرتے گوپال مینڈک کے پیٹ کی طرح ان کی رنگت زرد تھی۔ ساری مصیبتوں سے بے نیاز شانو آنگن میں جمے پانی میں ناؤ تیراتی رہتی۔ ناؤ ڈوبتی تو وہ اوراپو تالیاں بجاتیں اور ردّی کاغذ لے کر دوسری ناؤ بنانے لگتیں۔ لوگوں کے گھروں میں کھلانے کو نہیں ہوتا تو وہ کسی کی بیٹی کو بیاہ کر کیوں لے جاتے ہیں؟ یہ کہتے ہوئے اماں بھول جاتیں کہ اُنھوں نے آپا کی شادی کے لیے زمین آسمان ایک کر رکھے تھے اور جو بھی رشتہ ملا اُسے غنیمت جانا تھا۔ الیاس بھائی کے ذہن میں سوال اُٹھتا۔ لوگوں کے گھروں میں کھلانے کو نہیں ہوتا تو وہ اتنے بال بچے ہی کیوں پیدا کر لیتے

ہیں۔ بڑی آپا، منجھلی آپا، پھر الیاس پھر گڈو جو بھاگ کر کلکتہ چلا گیا تھا۔ اور واپس نہیں آیا تھا۔ پھر شاہینہ ـــــ ارے یہی شانو اور اس کے بھائی چھاتی سے چپکے تھے۔ منجھلی آپا کی شادی اور اماں کی زچگی ساتھ ساتھ ہوئی تھیں۔

پچھلے کئی دنوں سے ابا ٹھیل رہے تھے۔ نالائق جاتا کیوں نہیں رام آشرے بابو کے پاس ۔ان کا کلکٹر صاحب کے پاس آنا جانا ہے۔ شاید کہیں جگہ دلوادیں۔ افسروں کے یہاں تو نہ جانے کتنے لوگ روتے گاتے پہنچتے رہتے ہیں۔ لیکن رام آشرے بابو کی سفارش ـــ شاید ـــ شاید۔

ـــ میم صاحب نے ایک نگاہ الیاس میاں پر ڈالی۔ صاحب لوگوں کی کُنجی میم صاحب لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اس لیے رام آشرے بابو الیاس میاں کو کلکٹر صاحب کے سامنے لے جانے کی بجائے میم صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ ابا کتنے مرعوب رہا کرتے تھے رام آشرے بابو سے لیکن وہ لڑکی جیسی نازک اندام، دبلی پتلی خود سے اتنی چھوٹی ''میم صاحبہ'' کے سامنے جیسے بچھے جارہے تھے اور میم صاحب کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔
''مجھے ذاتی کام کے لیے آدمی چاہیئے۔'' وہ گویا ہوئیں۔ اس لڑکے کو کھانا پکانا آتا ہو تو بتائیے۔ چپراسی میں نام لکھوا دیا جائے گا۔ ڈیڑھ سو ملیں گے۔ کھانا ہم گھر پر ہی کھلا دیا کریں گے۔ اس طرح پچاس اور سمجھ لیجئے۔ الیاس میاں کا غصہ پھر لہو میں جذب ہوگیا۔ اور لہو جوش کھانے لگا۔ اس پر رام آشرے بابو کا کہنا'' کیا کہتے ہو میاں صاحبزادے۔ میم صاحب کے ساتھ رہو گے تو زندگی بن جائے گی۔'' الیاس گم سُم کھڑے تھے ـــ الخاموشی نیم رضا سمجھتے ہوئے میم صاحب کہہ رہی تھیں'' تو آپ لڑکے سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ ایمان داری کی ضمانت بھی تو چاہیئے۔ آج کل نوکروں چاکروں کا کوئی بھروسہ تھوڑی ہے۔''

یکا یک الیاس میاں نے چھلانگ لگائی اور بنگلے کی چاردیواری پھلانگتے ہوئے باہر بھاگے۔ بہت دیر تک رام آشرے بابو کو میم صاحب سے معذرت کرنی پڑی۔ کیسا بیہودہ لونڈا ہے پھر آیا کیوں تھا۔ کیسا موقع کھودیا۔ کلکٹریٹ کے چپراسی کی آسامی کے لیے لوگ ہزار دو ہزار خرچ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ابا کو معلوم ہوا تو کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ الیاس نوکری قبول کرلو۔ صاحب ہمیشہ تھوڑی رہیں گے یہاں۔ تبادلہ ہوگیا تو آفس میں ڈیوٹی مل جائے گی۔ باہر کسی

سے نہیں کہا جائے گا کہ تم کیا کام کرتے ہو۔ لوگوں پر رعب رہے گا کہ کلکٹر کے ساتھ ہو۔

الیاس بھائی کئی دن تک گم سُم رہے پھر اُنھوں نے اس آدمی کی تلاش شروع کی، جس نے ایک پیکٹ کہیں پہنچانے پر سو روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اتنا سا کام۔ پولیس بھلا ان پر کیوں شک کرنے لگی۔ اُنھوں نے دل کڑا کر کے سوچا۔ منحنی سے دو ہڈی کے انسان۔ جُھکے ہوئے شانے شریف صورت، شریف اطوار۔ پہلے کبھی اکسی اُلٹی سیدھی بات میں نام تک نہیں آیا۔ وہ ٹیچرز ٹرینگ کورس میں داخلہ لے لیں گے۔ اس کے بعد پرائیوٹ بی۔ اے بھی کر ڈالیں گے۔ ایل ۔ٹی گریڈ مل گیا تو ابا سے تو اچھے رہیں گے۔ دو سال کی ٹرینگ کے بعد ٹیچش والا دھندا چھوڑ دیں گے۔ پڑھائی کا خرچ نکال کر بھی اماں ابا کے لیے کچھ بچ جائے گا، لیکن ابا نے پوچھا کہ اچانک وہ کیا کرنے لگے ہیں تو؟ روپیہ ابا سے چھپانا ہوگا۔ صرف سوڈیڑھ سو روپے ماہوار ظاہر کریں گے۔ یہ کہہ کر کہ اس آدمی کی دوکان پر حساب دیکھتے ہیں۔ گواہی تو وہ دے ہی دے گا۔ دو ہفتوں کی تگ و دو کے بعد مچھش مل گیا۔ الیاس بھائی نے نیچی نظروں سے کہا کہ وہ اس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔

پانچ چھ ماہ بعد الیاس بھائی کو اس کام میں خوف کے باوجود مزا آنے لگا۔ اُن کی سپاٹ بے رنگ زندگی میں ذرا سا ایڈونچر گُھل گیا تھا۔ جن سستے جاسوسی ناولوں کو وہ دوستوں سے مانگ کر انتہائی انہماک کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، اب خود انہیں کا ایک کیریکٹر بن گئے تھے۔ ندی اس پار، ساکھو کے جنگل میں، کبھی مسجد کے کھنڈروں کے درمیان، کبھی پرانے مندر کے خشک تالاب کی سیڑھیوں کے پاس، کبھی سائیں بابا کے کنویں کے اندر ــــ وہ پیکٹ پہنچاتے رہے۔ مہینے میں تین، کبھی دو۔ ایک آدھ مرتبہ پانچ بھی۔ نعمت میاں کے فرضی نام سے اُنھوں نے ڈاک خانے میں اکاؤنٹ کھول لیا تھا۔ گھر پر سوڈیڑھ سو روپوں کا علان کر کے، باقی وہ اس میں ڈال دیتے تھے۔ اگلے ماہ سے سیشن شروع تھا۔ ٹیچرز ٹرینگ کورس کا فارم بھرا جا چکا تھا۔ داخلے کا امتحان ہونے والا تھا۔ اچانک نعمت میاں کے نام سے کُھلا ہوا فرضی اکاؤنٹ جس میں الیاس بھائی کے بہت سے خواب پروئے ہوئے تھے، ڈیڈ اکاؤنٹ میں تبدیل ہو گیا۔ ان روپوں کو کبھی کسی نے نہیں نکالا ۔کبھی کسی نے نہیں جانا۔ نہ جانے کب، کیوں، کیسے الیاس بھائی ساکھو کے جنگل میں جو ایک چھوٹے سے مُلک کی سرحد کے ساتھ ساتھ لگا چلا گیا تھا، مارے گئے۔ جب لاش ملی تو تقریباً نا

قابلِ شناخت تھی۔

——ابا اب نمک کم وبیش ہو جانے پر کھانے کی رکابی پھینکتے نہیں تھے۔ چُپ چاپ سر جھکا کر کھالیا کرتے تھے۔ بوڑھے، بیمار، کمزور ابا۔ شانو اب پچیس چھبیس سالہ عورت تھی۔ مُنی گیارہ بارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اپو کا بیاہ ہو چکا تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ الیاس بھائی کے مرنے کے بعد شانو نے بیاہ کی اُمید ہی نہیں کی۔ سر جھکائے، سر کے گرد دوپٹہ لپیٹے وہ اگر بتیاں بناتی رہتی تھی—چالیس پیسے سیکڑہ۔ یا سونٹھ بنانے کے لیے ادرک چھیلتی تھی۔ چالیس پیسے کلو کی مزدوری کے حساب سے۔ اماں سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ جس دن الیاس بھائی کو اس حال میں دیکھا اُنہیں پالا مار گیا تھا۔ کیا ایک آدمی کے مرنے سے اتنا کچھ بدل سکتا ہے۔ شانو کبھی کبھی حیران ہو اُٹھتی تھی۔ الیاس بھائی زندہ رہتے تو کچھ کرتے۔ ان سے کتنی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ ابا یوں دائم المریض نہ بنتے۔ اب تو بہت سے لاعلاج امراض کا علاج نکل آیا تھا۔ دادی کی آنکھیں اس سڑک چھاپ عطائی سے نہ کھلوائی جاتیں۔ اس نے نہ جانے کیا کر دیا کہ دونوں آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ اندھی ہو کر مریں۔ روشنی جانے سے ایک مصیبت بن گئی تھیں۔ اپنی محرومی کا بدلہ گھر کے افراد سے چُکاتی تھیں۔ چُکانا تو ساری دنیا سے چاہتی تھیں، لیکن باقی دنیا ان کی پہنچ سے باہر تھی۔

خشک اگر بتیاں اُٹھاتے ہوئے شانو نے ایک نظر آسمان پر ڈالی اور دوسری اپنے ہاتھوں پر جو اگر بتیاں بناتے بناتے اُودے پڑ گئے تھے۔ ان نظروں میں نہ کوئی شکوہ تھا نہ شکایت۔ صرف ایک گہری بے نیازی تھی۔ آگ جل چکنے کے بعد راکھ ہو جانے کا تاثر۔ جہاں کوئی اُمنگ ہو نہ خواہش وہاں شکوؤں کا کیا سوال۔

چل مُنّی—جا—جا کر اگر بتیاں دوکان پر دے آ۔ کہاں مر گئی؟ نکل گئی ہوگی وہیں اپو کے یہاں۔ آج کل اپو کی ننھی بیٹی آئی ہوئی ہے۔ دادی ابھی حیات ہیں اور مزے میں ہیں۔ ہوش وحواس سب باقی ہیں۔ اپو کی ماں سب کو بہت مانتی ہیں اور بڑا اسلوک کرتی ہیں۔ ورنہ اگر بتیوں اور سونٹھ کی ادرک کی مزدوری سے کہیں گھر چلا کرتا ہے۔ شانو نے دوپٹہ مزید کس کے کانوں کے گرد لپیٹا اور گلی میں سناٹا دیکھ کر جھپ سے نکل گئی۔

دادی کی گود میں اپو کی بیٹی گھسی بیٹھی تھی اور بغل میں مُنّی——

''تو بٹیا اِن رِشی نے کہا تو یوں تو مرنے سے رہا۔ ایک ہی ترکیب ہے مرنے کی۔ تو

جُون بدل لے۔ آدمی، جانور، کُتا، بلّی کسی کی بھی جُون۔ بردان تو راکھشس کی جُون کے لیے ہے نا۔ راکھشس نے کہا۔ دھر ماتما۔ ذرا گھوم پھر کر دیکھ آؤں کون سی جون اچھی رہے گی۔ میں نے تو دنیا اور اس کے باسیوں کو دیکھا ہی نہیں۔"

اور راکھشس نے دیکھا۔

جھگیوں میں، چالوں میں، جھونپڑیوں میں انتہائی درجے کی غربت اور غلاظت کے درمیان رہتے انسان۔ ٹرکوں سے کُچلے جانے، بارش میں بھیگنے، دھوپ میں جلنے کے باوجود فٹ پاتھوں پر رہتے اِنسان، دوسروں کے لیے غلّہ اُگا کر خود بھوکے مرتے انسان، قحط میں بھوک سے بلبلا کر بچوں کو دو مُٹھی اناج کے بدلے بیچتے انسان، اپنے ایسے پیاروں کو، جن کے بغیر زندگی کا تصوّر محال تھا، اپنے ہاتھوں جلا کر اور دفنا کر زندہ رہتے انسان، کوڑے کے ڈھیر پر جھوٹے پتوں کے لیے کُتوں سے لڑتے انسان۔ بقا کی جدّ و جہد میں فنا کے گھاٹ اُترتے انسان ——

اور اُس نے کہا اے مہان آتما مجھے انسان کی جُون دلوا دیجئے۔

انسان، رِشی ہنس پڑا۔ ارے یہ کیا بننا چاہتا ہے؟ اس سے تو اچھا ہے کتا بن جا بلّی بن جا۔ تو گیانی دھیانی دھر ماتما انسان کو سمجھا نہیں؟

راکھشس نے کہا۔ مُنی ور، میں زندگی سے اُکتا گیا ہوں اور انسانوں میں زندہ رہنے کی تڑپ ہے۔ ہر حال میں زندہ رہنے کی۔ اور میں اس تڑپ کو چاہتا ہوں۔ تو بیٹا۔ رِشی مہاراج نے اس کو آدمی کی جُون دلوا دی۔ وہ انسان کی عمر کے سو سال پُورے کر کے مرا۔ اور جب مرنے لگا تو اس کی خواہش تھی۔ کاش کچھ دن اور جی لیتا۔

"میری سمجھ میں یہ کہانی نہیں آتی دادی!" مُنّی نے اپنی معصوم حیران آنکھیں اُٹھا کر کہا۔

"دس بارہ سال پہلے میری سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی۔" شانو نے آنچل سے آنکھیں پونچھیں۔ بس کہانی سننا اچھا لگتا تھا، اس لیے سُنتی تھی۔ اب زندگی اپنی تمام تر تلخ حقیقتوں سمیت شانوں پر سوار ہے اور چاروں ہاتھ پیروں سے جکڑ چکی ہے۔ کیسا کیسا جی چاہتا ہے کہ اُسے اُکھاڑ پھینکوں، لیکن ہزاروں لاکھوں انسان اسی طرح زندہ ہیں۔ اُداس آنگنوں میں، کھنڈر جیسے مکانوں میں۔ ایک وقت کھا کر دوسرے وقت کی فکر میں گُھلتے۔ خالص ہنسی سے محروم —— محبت کی

چاشنی سے نا آشنا۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور بے مقصد، بے رس، بے رنگ زندگی آگے بڑھتی جاتی ہے۔

اسے جینے کی اُمنگ سمجھ کر دادی کی کہانی کے راکھشس نے جینا چاہا تھا، لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ جینے کی خواہش اور مرنے کے خوف کا فرق بال سے زیادہ باریک ہے اور تلوار سے زیادہ تیز۔ مرنے کے خیال سے ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر دوڑ جاتی ہے۔ الیاس بھائی کی سیاہ لاش۔

آہا—— کون جانے کون جینے پر مجبور کرتا ہے۔ جینے کی اُمنگ یا مرنے کا خوف۔

شانو نے پھر آنکھیں پونچھیں۔ چل مُنّی اٹھ۔ اور دل میں کہا...... اس سوال کا جواب نہیں ملے گا۔

قصہ جانکی رمن پانڈے

اب کوئی پوچھے ان جانکی رمن پانڈے ایڈوکیٹ سے کہ اچھے بھلے الہ باد میں تھے، رسول پور کہاں جا مرے۔ وہ بھی محاورۃً نہیں حقیقتاً۔ یوں تو عام عقیدہ ہے کہ مرنے کی ساعت اور جگہ پہلے سے طے ہوتی ہے (ویسے مرنے سے بھی بڑے کچھ واقعات کی ساعت پہلے سے طے ہوتی ہے مثلاً شادی) لیکن سوال یہ ہے کہ عقیدہ یہ کہتا ہے تو ہنگامہ کاہے کا۔ مگر کیا کیجئے۔ ایک سے ایک فتین دماغ موجود ہیں۔ انکا یہ بھی سوچنا ہے کہ مرنے کی جگہ اور ساعت، تو اوپر والے حاکم نے طے کردی۔ کچھ تو ایسا ہو جو ہمارے ہاتھوں میں بھی رہے۔ اب ہم مُردے پر نو من مٹی ڈالیں یا مٹی کا تیل (یوں تو زندوں پر مٹی کا تیل ڈال کر پھونکنے کی روایت بھی خوب قائم ہوگئی ہے۔) یا اسے چیل کوؤں کو کھلائیں۔ اور بھائی سو باتوں کی ایک بات یہ کہ عقیدے وہی اچھے لگتے ہیں جو اپنی مرضی اور سہولت سے میل کھائیں ورنہ اٹھایا ڈنڈا اور اپنی مرضی منوانے پر تل گئے۔ ہمارا تو یہی عقیدہ ہے۔ اب دیکھ لیجئے پانڈے جی کا حال۔

پانڈے جی کا پورا قصہ تو کے۔ کے ماما سناتے تھے۔ کے۔ کے۔ یعنی کرشن کانت۔ اسی مخفف سے جانے جاتے تھے۔ ٹائٹل لگانا انہوں نے بہت دن ہوئے کہ چھوڑ دیا تھا۔ کہتے تھے اس کلجگ میں سارے باہمن پنڈت چوڑے چمارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگے، کھان پان تک کا پرہیز نہ رہا۔ کاہے کو باپ دادوں کا نام کیچڑ میں گھسیٹیں لیکن کرشن کانت کے سارے چیلے چپاٹی جانتے تھے کہ یہ سارا کچھ ان کی مسخری شخصیت کا ایک حصہ تھا۔ وہ ذات پات کے سخت مخالف تھے۔

ٹائٹل استعمال نہ کرنا دراصل ان کے احتجاج کا مظہر تھا۔ کے۔ کے کا اپنا بھانجہ تو شاید کوئی تھا بھی نہیں ۔ نہ جانے کس ستم ظریف نے نام کے آگے ماما لگا دیا۔ بس وہ جگت ماما ہو گئے ۔ خاصہ طویل عرصہ لکھنؤ میں گذرا تھا اچھی اُردو بولتے تھے۔ قصہ گوئی کے شوقین تھے۔ نخاس کے کسی داستان گو کی روح ان میں حلول کر گئی تھی (ایسا خیال کبھی جانکی رمن پانڈے نے ہی ظاہر کیا تھا) وہ پان ایک گال سے دوسرے میں ٹھیلتے اور منھ اوپر کر کے کہ پیک کی چھینٹیں سننے والوں پر نہ پڑیں عجیب گول گول لہجے میں بولتے لیکن نہ جانے کیسے سحر طراز تھے کہ سامعین اٹھنے کا نام نہ لیں ۔ دے قصہ پہ قصہ۔

سامعین میں خاص الخاص تھے لانبے چوڑے کنبے کے سارے نوجوان، دو ایک اڑوسی پڑوسی جن میں مرزا انور بیگ کی بیوی نیرہ بیگ بھی شامل تھیں اور جو آیا گیا ہو وہ الگ ۔ انور بیگ شاید واحد ہستی تھے جو کے۔ کے ماما سے چڑتے تھے...... ''زنخہ کہیں کا'' ان کا کمنٹ ہُوا کرتا تھا...... عورتوں جیسی گپ بازی کرتا ہے۔ خاندان میں فلانایوں اور ڈھکانایوں ...... مگر انور بیگ کچھ بھی کہیں کے۔ کے کی مقبولیت میں کبھی پتہ نہیں لگا سکے۔ وہ آئے نہیں کہ جمگھٹ لگا۔ خاص کر جاڑوں میں کہ مونگ پھلیوں کی ڈھیری اور گرم گرم چائے کی پیالیاں سامنے ہوں، تسلے میں آگ جل رہی ہو اور سامنے بیٹھے ہوں دُلائی میں ملفوف کے۔ کے، خاصے مسخرے سے لگتے ہوئے۔ راوی تفریح کی جنت لکھتا تھا۔

ایسے ہی کسی جاڑے میں انہوں نے جانکی رمن پانڈے ایڈوکیٹ، جو ادھر اچانک بیٹھے بیٹھے رسول پور جا مرے تھے اور عجب کرائسس پیدا کر گئے تھے، کا قصہ بیان کیا تھا جو کچھ اس طرح تھا......

''پانڈے جب چھوٹے تھے (اور اس بات کو بہو۔ او۔ اوت دن ہو گئے کہ پانڈے چھوٹے تھے) تو ان کی اماں جو نپڈ تائن کہلاتی تھیں پرلوک سدھار گئیں۔ وہ ہماری اماں کے پھپھیرے بھائی کی سالی کے جیٹھ کی چچازاد بہن ہوتی تھیں۔ رشتہ تو تھا ہی، تعلقات بھی تھے۔

جتنا رشتہ تھا، تعلقات بھی اتنے ہی تھے یا کچھ کم بیش......؟ پُپن بھیا کو لنگڑی لگانے کی عادت تھی چاہے داستان ہو چاہے زندگی۔

اب بھیا تعلقات ناپنے کا تو کوئی پیمانہ ہم نے ایجاد نہیں کیا مگر ہاں تعلقات تھے اور

بہت تھے اور رشتہ بھی کون سا کم تھا۔ ارے میاں پہلے لوگ خط میں لکھواتے تھے، تھوڑے لکھے کو بہت جانیو...... سو لکھے کو ہی نہیں تھوڑے رشتے کو بھی بہت جانتے تھے اور نبھاتے بھی تھے۔ ہم بھی انہیں میں سے ہیں۔ ماما نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔ پیک کی خاصی مقدار اُڑی اور فضا میں تحلیل ہوئی۔ انہوں نے باچھیں پونچھیں۔

اچھا خبر دار...... اب جو کوئی بیچ میں بولا۔۔ پپن بھیا کو نیرّہ بیگ نے ڈانٹا۔ ویسے بھی سب کو ڈانٹنے کا ٹھیکہ انہوں نے ہی لیا ہوا تھا بشمول انور بیگ۔

تو بٹیا پانڈے کی اماں مریں تو کچھ دن بعد ان کے ابا نے کرلیا دوسرا بیاہ۔ اس وقت لوگ باگ ضرورت سمجھتے تو بیوی کے مرنے کا بھی انتظار نہیں کیا کرتے تھے۔ مزے سے دوسرا بیاہ کر لیتے تھے۔ انہوں نے مرنے کے بعد کیا تو کیا گناہ کیا۔ وہ بھی خاندان کی بڑی بوڑھیوں کے اصرار پر کہ آئے ہائے پنڈت۔ بن ماں کا بچہ کیسا رُل رہا ہے۔ دوسرا بیاہ کرلو نہ۔ پانچ برس کا لڑکا۔ کیسے پالو گے۔

نیرّہ بیگ نے کہاں تو ابھی پپن بہاری کو ڈانٹا تھا لیکن خود کو باز نہ رکھ سکیں۔ ٹپ سے بولیں کہ اور جو کہیں پنڈت مرے ہوتے تو کوئی نہ کہتا کہ آئے ہائے پنڈتائن دوسرا بیاہ کرلیوٗ۔ اور تب پانڈے مزے میں پل بھی جاتے۔ کوئی نہ سوچتا کہ پانڈے کیسے پلیں کے اگر ان کی اماں بن بیاہی بیٹھی رہ گئیں تو......'

'لے تو پانڈے کو کوئی ان کی اماں نے پالا؟ والد صاحب قبلہ نے کرلیا دوسرا بیاہ اور اب کے جو پنڈتائن لائے وہ پانڈے کی بڑی بیاہی بہن اُو ماسے بس کوئی سال بھر چھوٹی تھیں......'

'اے ہے ماما، سال بھر چھوٹی کہ سال بھر بڑی؟' نیرہ بیگ نے پھر ٹہوکا دیا۔

''اب نیرہ بی بی، رہیں تو وہ سال بھر چھوٹی۔ تمہراجی چاہے تو کہہ لیوٗ کہ بڑی تھیں۔'' ماما نے گلوری پھر ادھر سے ادھر ٹھیلی۔

'ماما۔ اب کی کوئی بولے تو جھاڑ یے اس کو ایک لپڑ۔' کانتی دی نے کہا۔ وہ قصہ آگے نہ بڑھ پانے کی وجہ سے چیں بہ جبیں تھیں۔

تو بھیا۔ ماما نے پن ڈبہ کھول کے ذرا سا خوشبو دار تمبا کو اور منھ میں سرکایا۔ اب ہم کیا لپڑ جھپڑ کریں گے۔ تم بس آگے کی سُن لو۔ تو پنڈت جی کی جو بٹیا الہ باد میں بیاہی گئی تھیں وہ سب

سے بڑی تھیں اور ویسے تو ان کا نام دیوی کے نام پر اومار کھا گیا تھا لیکن سارے لڑکے بالے انہیں دِڈّا دِڈّا کہتے تھے۔ بس کوئی اٹھارہ برس کی تھیں۔ انہوں نے مائکے کے رنگ ڈھنگ دیکھے کہ نئی ماں تو ماتھے پہ ٹیکہ سجائے پائل چھنکاتی رُن جُھن گھومتی ہیں اور والد صاحب یا مردان خانے میں رہتے ہیں یا نئی ماں کے آگے پیچھے ریشہ خطمی ہوتے نظر آتے ہیں تو انہوں نے سسرال واپس آ کے کیا یہ کہ اٹوائی کھٹوائی لے کے پڑ گئیں اور شوہر سے کہا کہ ہم تو بھیا کو ساتھ رکھیں گے۔ تین بہنیں بیچ میں مر کے یہ بھائی پیدا ہوا تھا اور اس پر سوتیلی ماں مکھیاں بھنکار ہی ہے۔ ایک کٹورا دودھ کو ترستا ہے جب کہ گھر میں دو گئیں بندھی ہیں۔ شوہر نے کہا بھائی ہم نے کب منع کیا۔ تم یہی بات سیدھے سبھاؤ نہیں کہہ سکتی تھیں؟ یہ رانی کیکئی بننے کی کیا ضرورت تھی جب کہ تم تو ہماری اکیلی اکلوتی بیوی ہو۔ دِڈّا خوش خوش دوسرے ہی دن واپس آئیں اور پانڈے کو ساتھ لوا لے گئیں۔ سوتیلی ماں نے سوچا خس کم جہاں پاک۔ ان کی پائل کے گھنگھرو اور زیادہ چھنکنے لگے۔

پانڈے کو دِڈّا پیار سے بھیّن کہتی تھیں اور بھائی نہیں بٹیا سمجھتی تھیں۔ اپنے لڑکے بالے ہو گئے تو بھی بھیّن کا درجہ کم نہیں ہُوا۔ جو نہ جانتے وہ یہی سمجھتے کہ بھیّن پہلوٹھی کے ہیں۔ ان کے شوہر اونکار ناتھ مشر نے بھی سالے کو کم مان دان نہیں دیا۔ دِڈّا جیسی بیوی پا کر خود کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔ شکل سے نُور برساتی برہمنی، صاف گوئی اور وعدہ وفا کرنے میں راجپوتنی، سارا حساب کتاب رکھنے، زمین جائداد دیکھنے میں ویشۂ اور کھٹ کے خدمت کرنے میں شوُدر۔ اونکار آگے پیچھے گھومتے۔ جو کہتیں وہ کرتے۔ بھیّن کو بھرپور تعلیم ملی۔

بی۔ اے کے فائنل اِئر میں تھے کہ ارمان بھری دِڈّا جا کے ان کا رشتہ طے کر آئیں۔

کے۔ کے ماما نے گلوری کے ساتھ پہلو بھی بدلا اور قصے میں ذرا ڈرامائی کیفیت پیدا کی۔ حاضرین اب نہایت مودب دم بخود بیٹھے کلائمکس کے منتظر تھے۔

'اب بھیا یہ سُن لیوَ کہ ادھر دِڈّا رشتہ طے کر کے آئیں ادھر کسی نے جا کے بھیّن سے جڑ دیا کہ لڑکی تو جی بھر کے کالی ہے۔ بھیّن کا جی ڈوبنے لگا۔ بڑی ہمت کر کے دِڈّا کے پاس گئے۔ وہ تخت پہ چڑھی بیٹھی دھوبی کا حساب، کر رہی تھیں۔ تبھی چور جیسی شکل بنائے، نظریں جھکائے، قمیص کا دامن مروڑتے بھیّن دبے پاؤں آ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پیچھے یُوں کہ دِڈّا کی سیدھی نظروں سے بچے رہیں اور دل کی بات گوش گذار کر سکیں۔

دِدّا...... کچھ دیر بعد ان کے منہ سے مری ہوئی آواز پھوٹی۔

''اے ہے مَرا پھر بٹن توڑ لایا۔''

بھیّن گڑ بڑا گئے۔ بچپن میں قمیض اور نیکر سب کے بٹن چباتے اور دِدّا سے بڑی ڈانٹ سنتے تھے لیکن اب...... کیا اب بھی کوئی بٹن ٹوٹا ہے۔ نہیں تو دِدّا...... کہاں...... وہ جلدی جلدی بٹن ٹٹولنے لگے۔

ارے تُو ؟ یہاں کہاں کھڑا ہے رے؟ تجھے نہیں اس مرے دھوبی کو کہہ رہی تھی۔ دھوتیاں چار، چادریں دو، جاکٹ ایک......

دِدّا، بھیّن نے اطمینان کی سانس لے کر سر کُھجایا......

کیا ہے رے...... نازل ہو جاتا ہے وقت بے وقت۔ نہ صبح دیکھے نہ شام......

اچھا دِدّا...... بھیّن پھر گڑ بڑا گئے...... ہم پھر بات کریں گے۔

تجھے نہیں اس مرے دھوبی کو کہہ رہی تھی...... آ بیٹھ، بیٹھ نہ...... پیچھے کاہے کو کھڑا ہے۔ انہوں نے لادی سرکا کر بھیّن کے لیے تخت پر جگہ بنائی۔ دیکھ نہ۔ ناشتے کا وقت ہے اور پہنچ گیا۔ طرہ یہ کہ کپڑے پھٹکے اور غائب غلہ۔ انہوں نے دھوبی کی نقل بنائی...... حساب کر کے رکھئے، پڑوس سے ہو کے آتے ہیں۔ اب تو بول کیا کہہ رہا ہے......

دِدّا...... پانڈے نے ہمت بٹوری اور اپنی دانست میں بم کا گولا چھوڑا۔

''سنا ہے مرجا پور والی کالی ہے اور تم زبان دے آئیں۔''

کیا؟ دِدّا کے ہاتھ سے کاپی پنسل گر پڑی۔ بھیّن سے ایسی بے حیائی کی توقع انہوں نے نہیں کی تھی۔ پیٹ کے جائے جیسے ماں جائے کو انہوں نے گھور کے دیکھا۔ پانچ برس کا تھا تو لے آئی تھیں۔ پالا پوسا۔ خدمت کی۔ پڑھایا لکھایا۔ اس کی یہ مجال۔ حالانکہ پانڈے بے چارے کی کیا مجال تھی کہ پوری بات دل کی گوش گذار کر سکتے۔ جب سے شادی کی بات سُنی تھی ایک چاند سا مکھڑا آنکھوں میں کوندھنے لگا تھا اور کہاں اچانک اس پر کسی نے سیاہی پھیر دی۔ مستقبل کی یہ تصویر بڑی روح فرسا تھی کہ صبح صبح آنکھ کھلی نہیں کہ کالی مائی حاضر۔ انہوں نے اتنا کچھ نہ کہہ کر بس ایک ڈھکا چھپا جملہ ہی کہا تھا۔

سُنو بھیّن۔ دِدّا نے غصے سے دھوبی کی گٹھری پر ہاتھ مار کر کہا۔ صورت دیکھی جاتی ہے

رنڈی کی۔ بٹیا کا تو خاندان دیکھا جاتا ہے۔سَو خاندان ہزاروں میں ایک ہے۔ ماس مچھی تو کیا کوئی پیاز لہسن تک نہیں کھاتا۔سوشریفوں کے ایک شریف۔اور تو اور بٹیا نے ہائی اسکول پاس کرلیا ہے۔اگلے منگل کو برتچھا ہے۔مگر آپ جا کر فی الحال پڑھائی میں دھیان لگایئے۔

اس بیچ ناشتے کی پکار لگاتے اونکارناتھ مشر عرف بھیّن کے جیجاجی ادھر کو آن نکلے تھے اور ہونے والی سلیچ کے پورے خواص سُن لئے تھے۔بڑی سنجیدگی سے بولے'' برخوردار فی الحال خاندان والی سے بیاہ کرلو بعد میں کبھی ایک صورت والی بھی لے آنا۔''

دِڈا نے اس وقت اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں تریر کے شوہر کی طرف دیکھا تھا لیکن پانڈے نے بات گرہ میں باندھ لی اور خوشی خوشی کالی مائی کو بیاہ لائے۔اپنے پیٹ کے جائے بیٹے کے بیاہ سے پہلے ہی دِڈا کے آنگن میں پائل چھنکاتی بہو آن اُتری۔

پانڈے کو دِڈا سے بڑی محبت تھی۔ہونی بھی چاہیے تھی۔لیکن وہ مہربان بہنوئی کی قدر بھی کچھ کم نہیں کرتے تھے۔کرنی بھی چاہیے تھی۔جس باپ کے نطفے سے تھے اس نے پلٹ کر شاذونادر ہی پوچھا تھا۔سارا کچھ تو ان بہنوئی کا ہی دیا ہُوا تھا۔اب وہ وکالت بھی اس لیے پڑھوا رہے تھے کہ خود وکیل تھے۔کہتے تھے بھیّن کو گھر میں ہی اچھی ٹریننگ مل جائے گی۔جمے جمائے کامیاب وکیل کے زیرِ سایہ پریکٹس کریں گے تو بہت جلدی چل نکلیں گے۔اب ایسے دیوتا جیسے بہنوئی کی بات وہ کیسے اٹھا دیتے۔سو تعلیم مکمل کرنے کے کچھ برس بعد جب ان کی وکالت چل نکلی تھی اور وہ پوری طرح خودکفیل ہو چکے تھے وہ ایک صُورت والی بھی لے آئے۔

کے کے ماما نے قصے کی اس اسٹیج پر آکر ٹھنڈی سانس بھری۔گرم چائے دوبارہ طلب کی۔حاضرین کا اشتیاق بڑھا۔ماما نے ایک ڈرامائی بریک لیا تھا۔

بریک میں پپن بھائی صاحب نے چھت اکھاڑ قہقہہ لگایا۔کہنے لگے یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ وہ صورت والی مسلمنٹی تھیں لیکن ان سے سابقہ کہاں، کیسے پڑا یہ تو ماما ہی بتائیں گے۔

جواب میں ماما نے گلوری پھر ایک گال سے دوسرے میں ٹھیلی اور پیک کو منھ میں سنبھالا۔

'' چائیے نہ تھوک کیوں نہیں آتے ہیں......'' کسی سامع نے ٹوکا۔'' اے چُپ......'' ایک اور سامع سے اُسے جواب ملا۔'' چائے آنے دے۔ماما ذرا فریش ہو جائیں۔''

چائے فوراً ہی آ گئی۔ نیرہ بی بی نے سب کے لیے پیالیوں میں اُنڈیلی اور آنکھیں تر یر کر پپن سے بولیں اس ''مُسلمنٹی'' پر تو میں تم سے بعد میں نمٹوں گی ذرا پہلے ماما سے قصہ سن لوں۔ اس پر پپن نے تڑ سے جواب دیا تم ہم سے کیا نمٹو گی نیرہ بھابھی کتنا کہا کہ کوئی اپنی جیسی خوبصورت مسلمنٹی ڈھونڈ دو تو نہ لا کے دی۔ ہم تو اب تمہیں پہ عاشق ہونے والے ہیں۔ اس سالے انور کی قسمت۔ وہ جو کہہ گئے کوئی استاد کہ پہلوئے حُور میں...... نیرہ نے پپن کی گردن پہ تھوڑی سی گرم چائے چھلکائی...... مرو کمبخت...... ہندو چے......

گلوری کا ملبہ تھوک کے کلی کرنے کے بعد چائے سڑ کتے ہوئے ماما نے داستان کا سرا پھر پکڑا۔ سامعین بھی چائے کی چسکیاں لگا رہے تھے۔

'باتیں تو بہت اڑائیں یار دوستوں نے۔ اُسے رنڈی مُنڈی بھی بنا ڈالا۔ لیکن۔ یہ بات قطعی نہیں تھی۔ نہ ہی اس صورت والی کا خاندان کچھ ایسا ہیٹا تھا۔ رہا مسلمنٹے مُسلمنٹی کا سوال تو میاں کوئی کہہ دے ان نیرہ بی بی کی صورت دیکھ کے کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ماتھے پہ نہ کوئی ذات لے کے گھومتا ہے نہ مذہب اور میاں ہمارا بس چلے تو ہم دنیا کے سارے مذاہب بین کرادیں۔ انسانوں کے بیچ ان سے زیادہ تفرقہ کسی نے نہیں ڈلوایا...... ماما نے اتنے طیش میں آ کے یہ آخر کا جُملہ ادا کیا کہ حاضرین ذرا کی ذرا سکتے میں آ گئے۔ ماما پھر نارمل ہو گئے جیسے اکثر طیش میں آ کے لوگ ہو جایا کرتے ہیں۔

پانڈے کے جیجا جی پنڈت اونکار ناتھ مشر ایڈوکیٹ کے پرانے فرمانبردار منشی تھے منشی رجب علی۔ عمر میں اونکار ناتھ سے تھوڑے بڑے۔ رجب علی کے والد امتیاز علی اونکار ناتھ کے والد کے وقتوں سے گھر میں دخیل تھے۔ زمینیں انہیں کے حوالے تھیں۔ بڑے ہی ایماندار منیجر تھے۔ بیٹے کو پڑھایا لکھایا تھا سو رجب علی ان کے منشی بن گئے۔ دِدّا انہیں رجب علی بھائی صاحب کہتیں۔ جب کبھی امتیاز علی آتے تو گھونگھٹ کاڑھ کے پیر چھو کے پرنام کرتیں ہاں ان لوگوں کے گھر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ میاں یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ ایک دوسرے کے گھر کھائیں نہ کھائیں خلوص ضرور برتتے تھے۔ اب روٹی کا رشتہ تو قائم کیا لیکن دل کے رشتے توڑ لیے۔ تف ہے۔'' ماما نے پن ڈبے سے پھر گلوری نکالی۔

پرہیز پکے ہوئے کھانے اور گیلی چیزوں کا تھا۔ سُوکھے سامان، پان تمباکو پھلوں وغیرہ

سے عار نہیں تھا۔ سو عید میں رجب علی کے یہاں سے خوان آتا۔ تانبے کی نئی سینی پر سُوکھی سویاں لچھے، خشک میوے، شکر اور طرفہ تماشہ دُودھ خریدنے کے لیے ایک کنارے کچھ نئے کُر کرے نوٹ رکھے ہوتے اور سارے لڑکے بالوں کے لئے نام بنام عیدی کے لفافے بھی۔ یہ سارا سامان سینی سمیت دِدّا کی خدمت میں ہدیہ کیا جاتا۔ دِدّا ہر بار کہتیں۔ ارے رجب علی بھائی صاحب۔ پھر نئی سینی۔ کہا نہ ہمیں آپ کے ان برتنوں سے قطعی پرہیز نہیں جن میں کھانا نہ پکتا ہے نہ کھایا جاتا ہے۔ پُرانی لے آیا کیجئے اور پھر واپس بھی لے جایئے۔ مگر رجب علی ایک نہ سُنتے۔ دِدّا منشی رجب علی کے مرنے پر ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں۔ ساری سنیاں بھنڈار میں رکھی ہیں۔ جاؤ گنو تو معلوم ہوگا کتنی عیدیں ساتھ گذر گئیں۔

انہیں رجب علی کی ایک بیوہ بہن تھیں۔ عمر میں ان سے خاصی بڑی۔ ان بہن کی ایک نواسی تھی۔ اس کی ماں جوانی میں ہی مر گئی تھی۔ باپ نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ رجب علی بیوہ بہن اور یتیم نواسی کو گھر لے آئے۔ اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اس لیے بہت چاہتے تھے۔ بڑے ارمان سے اس کی شادی کی تھی۔ دِدّا نے بھی جوڑے باگے بھیجے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد معلوم ہوا جس لڑکے سے شادی کی ہے وہ دماغی مریض ہے۔ رجب علی کی قبل از وقت موت کا سبب بھی یہی صدمہ بنا کہ آخر کو اس عزیز نواسی کو خلع دلوانا پڑا۔ لڑکی گھر آ کر بیٹھ گئی۔ ایک چپ سی لگ گئی تھی اُسے۔ پہلی مرتبہ اس پر نظر پڑی تو پانڈے کی کھوپڑی بھک سے اُڑ گئی۔ لگا آفتاب سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ رجب علی کے انتقال پر وہ ان کے گھر گئے تھے اور لڑکی ان کے سامنے آ گئی تھی۔ رویا رویا چہرہ۔ آنکھوں میں گلابی ڈورے۔ اُنکی اچھی خاصی عمر ہو چلی تھی بہت سی اچھی صورتیں بھی نظر سے گذری تھیں لیکن یوں انہوں نے دل نہیں ہارا تھا۔

بظاہر رجب علی کی پرانی وفاداریوں کے صِلے میں پانڈے نے ان کے گھر آنا جانا بڑھایا۔ تحفے تحائف سے لاد دیا۔ بے چاری رجب علی کی بی بی۔ سیدھی سادی۔ اوپر سے شوہر کی موت اور اس بچی پر جو گذری تھی اس کے صدمے سے آئے حواس جاتے رہے تھے۔ بہت دن تک وہ کچھ نہ سمجھیں۔ رہیں دِدّا تو انہیں بسنت کی خبر ہی نہ تھی۔ چونکیں تو پانی سر سے اوپر بہہ رہا تھا۔ ہر ہر...... ہر ہر

ارے بھئین......! یہ ہم کیا سُن رہے ہیں؟

بھیّن چپ تو چُپ۔

''ارے بولتا کیوں نہیں۔ یہی ملی تھی۔ ایک تو مسلمان اوپر سے طلاق شدہ۔''

'ارے ہم پتھر سے بات کر رہے ہیں کیا......؟ دِدّا نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

عشق اچھے اچھوں کی مت پھیر دیتا ہے۔ دِدّا نے زیادہ ہنگامہ آرائی کی تو پانڈے کو جو کچھ سال پہلے چپ چپاتے بہن کی پسند کے آگے سر جھکا کے سات پھیرے لے آئے تھے، منہ کھول کے بولنا پڑا۔ گرچہ بولے نہایت رسان سے تھے کہ دِدّا آپ ماں سمان ہیں۔ اماں زندہ ہوتیں تو اس سے زیادہ احترام ہم ان کا بھی نہ کر پاتے۔ ہم نے آپ کی لاج رکھی۔ آپ ہم سے پوچھے بغیر ہماری زندگی کا فیصلہ کر آئیں، ہم نے سر آنکھوں پہ اُٹھایا۔ وہ پٹ رانی ہے۔ رہے گی۔ لیکن یہ ہماری محبت ہے۔ وہ بھی رہے گی۔

دِدّا گنگ ہو گئیں۔ بھیّن نے انہیں جواب دیا تھا۔ اس کے آگے تو کچھ کہنے سننے کو رہ ہی نہیں گیا تھا۔ ''واہ بھیّن صاحب واہ۔ بڑے سُورما نکلے۔ ایک یہ ہمارے پپن بھیا ہیں۔ لڑکی کا مذہب دوسرا نہیں تھا۔ صرف جات دوسری تھی۔ اماں نے ڈانٹ پلائی بس جھپٹ کے انہیں کے آنچل تلے آن چھپے۔'' ایک نے کہا

شیم۔ شیم۔ مشترکہ نعرہ بلند ہوا۔

اور پھر ذرا جنریشن گیپ کی بات کرنے والوں کے تو منہ لپیو جا کے۔ لوگ بلا وجہ آج کے لوگوں کو بدنام کرتے ہیں۔ یہ پچھلے کم نہ تھے۔ ایک اور کمنٹ۔

پپن کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کی رونکھی صورت دیکھ کے کوئی ان کی مدد کو آگے آیا...... اچھا ماما۔ پھر آگے بھی تو کچھ ہُوا ہوگا۔

آگے جو ہُوا وہ وِدھاتا کا کیا ہوا تھا۔ اس میں دِدّا، پانڈے اور ان کی مرجا پور والی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ جب پانڈے نے صورت والی سے بیاہ کیا اس وقت ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ یہی کوئی پانچ چھ برس کی۔ ادھر انہوں نے دوسرا بیاہ کیا اور سال کے اندر پٹ سے بیٹا۔ پھر دوسرے برس دوسرا بیٹا۔ اور ادھر تیسری بھی بیٹی۔ اب کی دِدّا سے نہ رہا گیا۔ بدھاوا لے کے گئیں۔ بڑے بڑے خاندانی جھومک بھاوج کو پہنائے۔ بھتیجوں کا منہ دیکھ کے نہال ہو گئیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ ان کی حسین وجمیل کم سن ماں نے جھک کر آداب کیا تو بلائیں لیں۔

دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو کہا۔ اس کے ہاتھ سے پان کی گلوری لے کر کھائی ۔ (پاندان پانڈے کی وجہ سے سجا رہتا تھا۔)

گھر واپس آ کر دِڈا نے ست نرائن بھگوان کی کتھا رکھوائی ۔ پرشاد لیکر ایک بار پھر اسی غیر مذہب بھاوج کے گھر گئیں۔ صاف صاف تو کچھ نہیں کہہ سکیں بس پرشاد آگے بڑھایا جو اس نے مسکرا کر دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں بڑے احترام کے ساتھ لیا، (کمبخت کیسی خوبصورت ہے۔ ہاتھ تو دیکھو چاندی کے لگتے ہیں دِڈا نے سوچا) پھر ماتھے پر لگا کے پی گئی۔ دِڈا بولیں ارے یہ تو بڑی فرمانبردار اور بڑوں کی عزت کرنے والی لڑکی ہے۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولیں۔ بھیّن کے ساتھ تمہاری جوڑی رام ستیا کی جوڑی لگتی ہے۔ ہم آج سے تمہارا نام جانکی رکھتے ہیں۔ معلوم ہے ستیامیا کا دوسرا نام جانکی تھا۔ بھیّن کے نام میں یہ نام شامل ہے۔ روشن آراء مسکرائی ۔ (نام میں کیا رکھا ہے کہہ گئے میاں شیکسپئر صدیوں پہلے کچھ ستم ظریفوں نے انہیں پر طبع آزمائی کر ڈالی ۔ کہاں ان کا نام تو شیخ زبیر تھا)۔

لڑکوں کے نام رکھے گئے تھے عامر اور صابر دِڈا نے عامر کو اَمر اور صابر کو سُبیر کر دیا۔ اس طرح سب کو خاندان میں شامل کر کے لوٹیں ۔ اسلام اور ہندو ازم کی خلیج انہوں نے پل بھر میں پاٹ کے رکھ دی۔ اتنی جلدی تو ہنومان جی کی فوج ہندوستان اور لنکا کو جوڑنے والا پل بھی نہ بنا پائی ۔ مگر اس ساری کاروائی کا ''فال آؤٹ'' ذرا گڑ بڑ تھا۔ جس خاندان والی کو دِڈا بڑے ارمان سے بیاہ کے لائی تھیں وہ دِڈا سے خاصی ناراض رہنے لگی ۔ میاں یہ ساس نند والے جھگڑے ہوتے تو سب جگہ ہیں ۔ لیکن شریف گھرانوں میں ذرا ڈھکے چھپے رہتے ہیں۔

ہاں صاحب شاہزادی این اور لیڈی ڈائنا میں کبھی نہیں بنی۔

واہ صاحب ۔ سیدھے انگلستان ہی پہنچ گئے ۔ اپنی دیسی صفدر جنگ روڈ کو کیوں بھول رہے ہیں۔

بات پانڈے سے سیاسی ہستیوں تک آ گئی ۔ چائے کے ساتھ مونگ پھلیوں اور غیبت کا دور بہت دیر تک چلا (بقول مشتاق یوسفی یہ دونوں جاڑوں میں بہت مزا دیتی ہیں) اور خاصی تفریح رہی۔

——یہ نشستیں اب بھی ہوتی تھیں لیکن وہ مزا نہیں رہ گیا تھا۔ کے۔ کے ماما محض بچپن

سال کی عمر (بقول خود بھری جوانی) میں کینسر کا شکار ہوئے اور دو برس میں چٹ پٹ ہو گئے۔ان کی کہانی کے ہیرو بھی ابھی ایسے بوڑھے نہیں ہوئے تھے۔بس ساٹھ سے کچھ اوپر آئے تھے۔کوئی چار کہ پانچ برس۔کسرتی بدن تھا۔مرنے کے آثار ابھی دُور تک نہیں تھے۔لگتا تھا اسی پچاسی سے پہلے تو ایک اینٹ نہیں کھسکنے کی۔عمارت کی کون کہے۔ہاں ڈِامر چکی تھیں اور لڑکیاں بڑی ہو گئی تھیں اس لیے بیوی کا دباؤ ان پر بڑھ گیا تھا۔جاتے بھی تو جلدی چلے آتے۔لیکن اس مرتبہ گئے تو سارا اگلا پچھلا حساب چکتا کر دیا۔وہیں مر گئے۔بس یونہی۔اچانک بیٹھے بیٹھے۔کے کیما تو ہیں نہیں ورنہ کہتے۔اب میاں نہ کسی پہ دل آنے کا کوئی وقت مقرر ہے نہ آندھی، شادی اور موت کا۔ کبھی کبھی ایسے اچانک آتی ہیں یہ کہ پوچھئے مت۔اب دیکھ لیؤ اچھے بھلے پانڈے گھر میں بیٹھے۔ اب یہ رسول پور کہاں جا مرے۔مانا کہ وہاں وہ رہ رہی تھی، ان کی چہیتی بیوی لیکن اُس گھڑی نہ جاتے تو شاید مرتے بھی نہیں۔اور مرتے بیشک لیکن رسول پور میں تو نہ مرتے۔

پانڈے نے جب روشن کو پروپوز کر کر کے اس کا ناک میں دم کر دیا تھا تو روشن نے ایک دن کہا تھا ''مگر پنڈت —— (وہ پانڈے کو اسی طرح مخاطب کیا کرتی تھیں) تمہارا اور ہمارا مذہب مختلف ہے۔اوپر سے تم ٹھہرے شادی شدہ...... دو بچیوں کے باپ۔اب تم لاکھ کہو کہ تم۔ہم پہ زہر کھاتے ہو......

مذہب —— پانڈے نے طویل سانس لے کے سر کھجایا تھا۔ہاں مذہب تو ہے۔تم مسلمان ہو ہم ہندو۔رہی بات ہمارے شادی شدہ ہونے کی تو اُسے کیوں درمیان میں لاتی ہو۔ تمہارے مذہب نے تو چار کی اجازت دے رکھی ہے۔

روشن آرا مسکرائیں۔''ہندو کے اوپر تو کوئی پابندی سرے سے ہے ہی نہیں۔چار کرو یا چالیس۔'' پانڈے جھنجھلائے...... ''ارے گورنمنٹ نے لگا دی نہ۔ورنہ ہمارے اجداد میں ایک صاحب تھے۔ایک ہی گھر سے چار بہنیں ایک کے بعد ایک بیاہ کے لائے۔پھر وہاں لڑکیوں کا سٹاک ختم ہو گیا تو ایک کوٹھے والی بھی رکھ لی۔مگر تم پر تو پابندی نہیں ہے نہ۔''

روشن آراء نے آنکھیں نکالیں۔ہم پر تو ہے۔ہمارے مردوں پر نہیں ہے۔بائی دی وے پنڈت تم ہمیں کیا سمجھتے ہو؟

''جانِ پنڈت''

''اس خالص ہندو لفظ کے ساتھ اضافت اچھی نہیں لگتی۔ جیسے ہماری تمہاری جوڑی، انمل بے جوڑ۔''

''روشن آرا تم ہم سے پٹ جاؤ گی۔''

روشن یک لخت سنجیدہ ہوگئیں ''پٹ تو ہم چکے ہیں۔ زندگی کی بساط پر ایک بے بضاعت مہرے کی طرح۔ پنڈت اب ہم کیا کریں؟'' اضطراری طور پر وہ ہاتھ ملنے لگی تھیں۔ ان کے لہجے میں بلا کی بے بسی تھی۔

کچھ مت کرو۔ بس چپ چاپ ہم سے بیاہ کرلو۔

تمہیں مذہب بدلنا پڑیگا۔ ہم کورٹ میرج نہیں کریں گے۔

کورٹ میرج تو ویسے بھی نہیں ہو پائے گی۔ گھر پر وہ جو ہے نہ مرجاپور والی اس سے کیسے انکار کریں گے کہ وہ ہماری بیاہتا ہے۔

تو؟ ہمیں رکھیل بناؤ گے کیا؟

اب کی سنجیدہ ہونے کی باری پانڈے کی تھی۔ جس سے یوں ٹوٹ کر محبت کی اس کی یہ بے حرمتی۔ پل بھر کو وہ گنگ ہو گئے۔

''بولو پنڈت۔'' روشن آرا کے لہجے میں ایک قطعی جواب کا اصرار تھا۔

''ہم نکاح کریں گے۔'' پانڈے کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''مذہب بدلنا پڑے گا۔ معلوم ہے نہ؟''

''اب وکیل کو تم پڑھاؤ گی روشن آرا بیگم۔ تم ایک عورت جس کے بارے میں بزرگ کہہ گئے کہ اس کی عقل ٹخنے میں ہوتی ہے۔

'ٹخنے میں کس کی عقل ہے اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ پہلے تم یہ سوچ لو کہ راستہ بڑا سنگلاخ ہے۔ اپنے اجداد کا مذہب چھوڑ کے......'

'ایسی کی تیسی۔' پانڈے نے ہونٹ کاٹے۔

'کس کی ایسی کی تیسی کر رہے ہو۔ مذہب کی یا اجداد کی؟'

'سماج کی۔ جس نے مذہب بنایا۔ مگر ہاں تمہارا مذہب تو آسمان سے اترا ہے۔'

'ابھی ہندو ہو اس لیے جو جی چاہے کہہ لو۔ مسلمان ہو گئے تو بے ادبی کی اجازت نہیں

ہوگی۔'

'یار تمہارے مذہب میں بڑا ریجی منٹیشن Regimentation ہے۔'

'شاید...... روشن آراء نے سوچا مگر کہا کچھ نہیں۔

گھر جا کر پانڈے رات کو بیوی کی بغل میں لیٹے تو انہیں نیند نہیں آئی۔ وہ سگرٹ سلگا کر برآمدے میں جا بیٹھے۔ دِدّا نے انہیں گھر سے جانے نہیں دیا تھا۔ بس بھائی کی انا کو ٹھیس نہ پہنچے، لوگ باتیں نہ بنائیں اس لیے شادی کے کچھ عرصے بعد جب وہ کمانے بھی لگے تو اپنے ہی بنگلے کے بغل کی خالی زمین پر بنے نئے کاٹج نما بنگلے میں منتقل کر دیا تھا۔ دونوں گھروں کا مشترکہ کمپاؤنڈ تھا۔ دِدّا کی نگرانی میں تربیت یافتہ مالی کے ہاتھوں سنوارا گیا باغ۔ ایسے ایسے خوبصورت درخت کہ کچھ کے تو پتے ہی پھولوں سے زیادہ دیدہ زیب لگتے تھے۔ ہوا ان کے بیچ سے ہو کر آئی تو کچھ زیادہ فرحت بخش محسوس ہوئی۔ چاند آسمان کے بیچوں بیچ نیلی چھت گیری میں فانوس کی طرح ٹنگا ہوا تھا۔ پانڈے سگرٹ پھونکتے وہاں بیٹھے رہے...... مولسری کی خوشبو تمبا کو پر حاوی ہو کر کسی سحر کی طرح ان کے گرد و پیش منڈلاتی رہی۔

ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی کہ وہ کرسی سے اُٹھ کر دِدّا کی طرف چل پڑے۔ ایک طرف سفید مُسنڈے کے بڑے بڑے جھاڑ کھڑے تھے۔ سُنا ہے گوتم بُدھ اپنے کسی جنم میں سری لنکا کے جنگلوں میں بھٹک گئے تھے۔ اماوس کی رات تھی۔ ٹٹولتے ٹٹولتے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک قطار در قطار سفید مسنڈے کے جھاڑوں میں چاندنی جیسے پھول کھل اٹھے۔ سارا جنگل روشن ہو گیا۔ یہاں سے وہاں تک چاندنی بکھر گئی۔ چاند کی نہیں، پھولوں کی چاندنی۔ تب گوتم بُدھ نے مُسنڈے کو دعا دی۔ وہ آج تک برقرار ہے اور سارے سال کِھلتا ہے۔ پتہ نہیں اس کہانی کا نفسیاتی اثر تھا یا ان پھولوں میں واقعی ایسا کوئی وصف تھا کہ دیکھو تو دل و دماغ میں ٹھنڈک سی اُتر جائے۔ کیا یہ گوتم بُدھ کی دعا تھی؟ اور کیا گوتم بُدھ نے نسلِ انسانی کے لیے دعا نہیں کی تھی؟ عقل سلیم کی دعا؟ دلوں سے کثافت دور ہونے کی دُعاء، پیدائشی خباثت سے نجات کی دعا، بڑھاپے، بیماری اور موت کے چکر سے آزاد ہونے کی دعا؟ یہ تو آج بھی اسی طرح انسان کو خوف زدہ کر رہے ہیں، اسی طرح دلوں میں دہشت بھر رہے ہیں۔ اماں...... پیاری اماں...... پانڈے اپنی جواں مرگ خوبصورت ماں کو یاد کر کے آب دیدہ ہو گئے...... رات کے اس پہر میں ان کے دل میں ہوک سی

اُٹھی۔ اماں مر کے کہاں گئی ہوں گی۔؟ کیا واقعی ویترنی پار کرنی پڑی ہوگی؟ کیا اس جہاں سے آگے اور بھی جہاں ہیں؟ کیا مرنے کے بعد پانڈے اماں سے مل سکیں گے۔ زندہ رہنے کے دوران ہر وقت ننھے جانکی رمن کو کلیجے سے لگا کر رکھنے والی اماں کیا ان کے لئے بے چین ہوتی ہوں گی؟ ہر سال گیا جا کے پنڈِ دان کرنے سے کیا واقعی اماں کی آتما کو شانتی ملتی ہوگی؟ آتما؟ آتما کیا ہے؟

(روشن آراء بھی منشی رجب علی کے نام سے فاتحہ پڑھ کے کہتی ہے کہ اس سے ان کی رُوح کو سکون ملتا ہوگا۔ اور ثواب بھی) گناہ اور ثواب کیا ہیں! روشن نے انہیں کبھی پیار نہیں کرنے دیا بس انگلیاں چھونے کی اجازت دی۔ یہ گناہ ہے...... اس کا جُملہ تھا جو تکیہَ کلام کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ (ویسے تو روشن بی بی تمہارے عقیدے کے مطابق تمہارا مجھ سے ملنا، یہ عورت مرد کے درمیان کی کشش کو راہ دینا ہی گناہ ہے۔) کس نے بنائے ہیں یہ گناہ و ثواب کے معیار...... وہ بے چینی سے تیز تیز چلنے لگے تھے...... اگر وہ کلمہ پڑھ کے کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہوں تو بھی وہ جانکی رمن پانڈے ہی رہیں گے یا کچھ اور ہو جائیں گے؟

پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ نہیں —— رہیں گے تو وہ وہی...... اپنے سارے علم و آگہی، وکالت کی مُوشگافیوں، اپنے جسم، اپنے رنگ و روپ، اپنے جذبات و احساسات، اپنے خیالات، اپنی کمینگیوں، خامیوں، اپنی تمام محبتوں کے ساتھ......

محبتیں —— ان کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیوی۔ بیوی کے لیے انہوں نے کسی ایسے لگاؤ، جذبات کے ایسے طوفان کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا جیسے روشن آراء کے لیے لیکن دڈا اور بیٹیاں...... کیا ان کے لیے پانڈے کے دل میں محبت صرف اس لیے کم ہو جائے گی (یا ختم ہو جائے گی) کہ وہ اپنے اوپر ایک نیا چپل چسپاں کر لیں گے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے جانکی رمن پانڈے —— انہوں ے اپنے آپ کو ڈپٹا —— پھر یہ کون سے جھگڑے ہیں۔ یہ اللہ بھگوان کے فرق...... یہ کیوں نہیں مٹ سکتے؟ (یہ کبھی نہیں مٹیں گے۔ انہوں نے بڑی تکلیف کے ساتھ سوچا۔)

اگلے ہفتے انہوں نے روشن آراء سے جا کہا کہ وہ کلمہ پڑھنے کو تیار ہیں۔

مگر روشن...... انہوں نے خاموش، جھکی پلکوں اور روشن چہرے والی روشن سے کہا......

میں وشنو کا بھگت ہوں ۔ میں دل سے انہیں نہیں نکال سکوں گا۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہ سارے نام یہ سارے تصورات مختلف اوقات میں انسانوں نے اپنے بنیادی سوالوں کے جواب میں ڈھونڈے ہیں ۔ یہ دنیا کس نے بنائی ۔لوگ مرتے کیوں ہیں ۔ مرنے کے بعد کہاں جاتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔ کیا دُنیا میں جو ناانصافیاں اور دُکھ ہیں ان کا کہیں کوئی صِلہ نہیں ہے؟ جنہیں قانون سزا نہیں دے پاتا ان گنہگاروں کو کیا کہیں کوئی سزا ملے گی؟ کیا نیکو کاروں کے لیے کوئی اجر ہے؟ یوں ہی بڑے ظلم اور گناہیں دنیا میں روشن بیگم۔ مذہب نہ ہوتا تو ان کی باڑھ آ جاتی ۔ مذہب انسانوں میں گھسے شیطانوں کے گرد لکشمن ریکھائیں کھینچتا ہے۔ دُکھ میں، کرائسس میں، طاقت اور صبر دیتا ہے۔ امیدیں جگاتا ہے...... یہ جو تم بات بات پر انشاء اللہ کہتی ہو...... ماشاء اللہ کہہ کر نظر بد سے بچنا چاہتی ہو...... روشن ـــــ تمہارا اللہ رحمٰن ورحیم ہے، پالن ہار ہے، گناہوں کو معاف بھی کرتا ہے اور گناہوں کی سزا بھی دیتا ہے، زندگی کا ضامن ہے اور موت کا بھی ۔ میرا وشنو بھی ان سارے خواص سے آراستہ ہے۔ بس ہم نے اسے تین الگ الگ صورتوں میں دیکھا ہے۔ وہ جو تخلیق کرتا ہے، وہ جو پالتا ہے اور وہ جو فنا کرتا ہے ۔ یہ تینوں ایک ہی ہستی کے روپ ہیں ۔ وہ مسکرائے ...... تمہارا اللہ جو رب العالمین کہلاتا ہے...... رب المُسلمین نہیں...... اس طرح وہ میرا بھی ہوا...... ہاں اب اعلانیہ طور پر میرا ہو جائے گا اور اس کے توسط سے میں تمہارا ہاتھ تھاموں گا لیکن جس صورت میں اسے اب تک پوجتا آیا تھا، پوجوں گا اسی صُورت میں روشن...... اور روشن بیگم...... دوسری بات یہ کہ میں اپنی بیوی، اپنی بچیوں اور ددّا کسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میری بیوی جیسی بھی ہے وِدھی ودھان سے بیاہی ہوئی بیوی ہے۔ اس کی پشت پر میرا پورا سماج ہے۔ سب کو کسی ایک رشتے پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ذرا سا توقف کیا اور مسکرائے...... مسز سمپن والے کنگ ایڈورڈ کی مثال مت دینا۔ وہ ٹھہرے راجہ...... وہ بھی انگلستان ۔ کہ ہم عام آدمی، جنتا جناردن...... ہندوستان کے نہایت پیچیدہ ورن آشرم کے شکار۔

ہاتھوں کے کٹورے میں چہرے کا چاند تھامے، غور سے پانڈے کا لکچر سُنتی روشن ہنسی...... ایک اذیت بھری ہنسی۔ پانڈے...... میں نے اپنا دل تمہارے حوالے کرتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ تم جانکی رمن پانڈے ہو اور میں روشن آرا۔ جب میں نے ناموں کے اندر چھپے فرقو پہچانا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ تمہارے جو جی چاہے کرتے رہنا بس کلمہ پڑھ کے انگلی میں خون

لگالو...... کیوں کہ مجھے نکاح کے علاوہ ساتھ رہنے کی اور کوئی صورت منظور نہیں ہے۔ میں تو تم سے گوشت کھانے تک کو نہیں کہونگی۔ پھر وہ کچھ غصے سے بولی...... گائے بیل کا چارہ ڈال دیا کروں گی تمہارے آگے جب تم میرے یہاں آؤ گے...... تمہاری بیوی کی حق تلفی کی سوچوں تو سُور کھاؤں...... میر یہاں آنے کی بات یہ ہے کہ جب چاہو آنا اور اتنے دن ہی رہنا جتنے میں تمہارا امن سکون درہم برہم نہ ہو......

اگلے ہفتے دونوں کا نکاح ہو گیا۔ جانکی رمن پانڈے نکاح سے پہلے ایک مسکین صورت، ڈرے سہمے مولوی کی موجودگی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ نکاح کے وقت روشن کی نانی یعنی رجب علی کی بی بی بہت اداس تھیں اور بے حد پریشان۔ انہیں اپنی پریشانی میں یہ پروا نہیں رہ گئی تھی کہ روشن نے ایک ہندو سے نکاح کیا ہے۔ انہیں رنج یہ تھا کہ وہ اونکار ناتھ کی بہو کو کیا منہ دکھائیں گی۔ کس منہ سے انہیں عید کی سویاں بھیجیں گی۔ ان کا دماغ سُن ہو رہا تھا۔ اس خاندان سے اتنے پرانے تعلقات ہیں انہیں کا گھر رہ گیا تھا سیندھ لگانے کے لئے۔ اب جانکی رمن ٹھہرے مرد انہیں کوئی کچھ نہ کہے گا گرچہ روشن نہ ان کے اوپر دیکھتے ہی عاشق ہوئی تھی نہ اس نے آنے جانے اور تعلقات پیدا کرنے کے بہانے ڈھونڈے تھے۔ بلکہ ابتدا میں تو وہ جانکی رمن کی آر جار کو نہایت مشکوک نظروں سے دیکھتی تھی۔ لیکن وہ زندگی کے نہایت تکلیف دہ اور نازک دور سے گذرتی ہوئی لڑکی تھی۔ توجہ اور محبت پائی تو ڈھلک پڑی۔ مگر یہ سب کون دیکھتا سنتا ہے اور کون وضاحتیں مانگنے کو دم بھر ٹھہرتا ہے۔ اور واقعی جانکی رمن کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ سب پھاند پڑے روشن آراپہ۔

کُلٹا، کُلچھنی۔ پہلے شوہر کو چھوڑ آئی۔ ایسی سُندر عورت کو کہیں مرد مارا کرتا ہے؟ آوارہ ہوگی تبھی مار کھاتی تھی۔ اس پر الزام دھر دیا کہ دیوانہ ہے۔ پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی تب ہی تو تین برس میں چوہے کا بچہ بھی نہ جنا اور یہاں...... ادھر پانڈے سے بیاہ رچایا اُدھر بیٹا۔ کیا پتہ پانڈے سے تبھی سے آشنائی رہی ہو۔ (پانڈے کے سات فرشتوں کو بھی تب روشن کے وجود کی خبر نہ تھی) بیسوا۔ دھرم، ادھرم کی بھی نہیں سوچی۔

برہمن کا دھرم بھرشٹ کر رہی ہے۔ سیدھی نرک میں جائے گی۔ ارے نرک میں بھی جگہ نہ ملے گی۔ نہ جانے کیا کیا کھلا رہی ہوگی انہیں۔ پھر ایک دن کچھ دُنیا جہاں کی سُنتے، کچھ خود

کہتے ، بیوی نے پانڈے سے کہا...... تم وہاں کھا کے آتے ہو۔ اپنے برتن الگ کرلو۔ یہاں ہمارے برتنوں میں مت کھانا۔

بیوی سے پانڈے بہت نرمی سے پیش آتے تھے۔ اور تو نہ جانے کس کس طرح اپنا دفاع کیا تھا اور اُسے پٹی پڑھائی تھی لیکن کھانے کی بات پر گیتا اُٹھا کے لے آئے۔ اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ۔ ہمارے وہاں رہنے پر بالکل الگ برتنوں میں الگ چولہے پر کھانا پکتا ہے۔ وہ خود ان دنوں گوشت مچھلی پیاز لہسن نہیں کھاتیں۔ شدھ ساتوک کھانا ہوتا ہے۔ اس ''وہ'' پر مرجاپور والی کے تن بدن میں آگ لگ جایا کرتی تھی لیکن پانڈے گیتا پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ایسے مظلوم، ایسے معصوم اور ایسے سچے لگے کہ اس کے بعد سے اس نے اس 'کھادیہ' اکھادیہ' کے مسئلے پر راڑ مچانا چھوڑ دیا۔

کھانے کو تو پانڈے نے قسم کھالی لیکن اس دن سے بہت رنجیدہ رہنے لگے۔ پہلی بار خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے انہیں اس آخری حد سے گذرنا پڑا تھا۔ لگا وہ وکیل نہیں ہیں مجرم کے کٹ گھرے میں کھڑے ہیں۔ رامائن کا وہ کا سوپان یاد آیا جہاں سیتا اگنی پریکشا سے گذری تھیں۔ وہ بہت دیر دیر تک بیٹھے سوچتے رہتے تھے یہ حلال حرام، کھادیہ۔ اکھادیہ ہے کیا؟ کوئی گوشت کھائے ، کوئی نہ کھائے۔ کوئی گوشت کھاتا ہو تو سور نہ کھائے۔ یا پھر گیا نہ کھائے۔ سبزی تک میں کہیں کہیں پیاز لہسن تک کا پرہیز جیسے خود پانڈے کے اپنے گھر میں ۔ ادھر دِدّا کے لڑکوں نے گھر میں پیاز کے پکوڑے بنوانے شروع کردیے تھے۔ دِدّا کے سسرال میں ان کے جیٹھ کے دو لڑکوں کے گھروں میں اس کھان پان کو لے کر چولہا الگ ہو گیا تھا۔ برسوں سے چلا آرہا مشترکہ خاندان بکھر گیا۔ دِدّا کے جیٹھ بے حد افسردہ خاطر رہا کرتے تھے۔ ان کے ایک لڑکے نے نہ جانے کس بُری سنگت میں گوشت کھانا شروع کردیا تھا۔ اس کی بیوی کسی نیول آفیسر کی لڑکی تھی اس لیے خاصی ماڈرن تھی ۔ اس نے گھر میں ہنگامہ کرنا تو کُجا شوہر کی ہمت افزائی کی۔ کھانے میں پیاز لہسن کی تو فراوانی تھی ہی پہلے چوری چھپے ہوٹل تک بات رہی۔ پھر جب ذرا ہیاؤ اور کُھلا تو ناشتے دان میں بھر کے مُرغا اور بریانی آنے لگے۔ چتر ویدی برہمن کے یہاں یہ غضب۔ رام رام رام۔ دونوں بھائیوں میں کُھل کے جھگڑا ہوا۔ بڑا پرانے خیال کا تھا اور باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کی زندگی تک یہ سب نہ ہوتا تو شاید یہ بات اتنی نہ بڑھتی ۔ اس نے چھوٹے کا چولہا الگ کرادیا۔ بڑا

سادو منزلہ مکان دو گھروں میں تقسیم ہو گیا۔ والدین بڑے بیٹے بہو کے ساتھ رہے۔ چولہا الگ ہوا تو ان سب چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر لڑائی ہونے لگی جو پہلے نظر انداز کر دی جاتی تھیں۔ ایک دن مذاق ہی مذاق میں خاصہ بڑا ہنگامہ ہو گیا۔ دیور نے بڑی بھاوج سے کہا بھابھی ایک دن مرغے کی ٹانگ چبا کے تو دیکھو۔ مرغا تو کیا آدمی کھانے لگ جاؤ گی۔ بھاوج اتنا چلائیں کہ سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ ایسی راڑ مچی کہ زمین جائداد تک کے بٹوارے کی بات ہونے لگی۔ (بٹوارے کی بات در اصل بہت دن سے بڑے بھائی کی بیوی کے ذہن میں تھی۔ اس کا اچھا موقعہ مل گیا)

انسان کس قدر احمق ہیں۔ کب تک رہیں گے بھلا؟

روشن آرا بتا رہی تھیں کہ ان کی اماں کبھی سُور کا نام نہیں لیتی تھیں۔ بُرا کہتی تھیں یا پھر صورت حرام۔ کہتی تھیں سُور کا نام لینے سے گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔

اور بی بی روشن آراء تم وہ لوگ ہو جو مرغا بکرا گائے بھینس حتیٰ کہ اونٹ گھوڑا اسب کھا جاؤ...... ایک سُور کو لے کے اتنا ہنگامہ۔

ہم تو نہیں کھاتے اونٹ گھوڑے۔ روشن بدک گئیں۔ اور بیف تم نے چھڑوا دیا۔

حلال ہیں نہ اونٹ گھوڑے۔ اور وہ تمہارے دُور کے رشتہ دار جو ہیں بدّن میاں...... انہوں نے چھ بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہونے پر اونٹ کی قربانی کی تھی۔ تمہارے یہاں بھی تو حصہ بھجوایا تھا۔ لوگ بیٹی پیدا ہونے پر اونٹ کی کیا بکری کی بھی قربانی نہیں دیتے لاکھ تم کہتے رہو کہ اسلام میں عورت کا درجہ بلند ہے لیکن مذہب اور سماجی عقائد میں ٹکراؤ ہر جگہ ہے...... پنڈت نے یہ بھی کہا تھا۔

ہم نے کہاں کھایا وہ اونٹ۔

پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ ارے حلال ہے نہ۔ تمہارے دھرم بھائی کھاتے ہیں۔ تم کھاؤ یا مت کھاؤ۔

مرغے کی ایک ٹانگ تو تم نے کر رکھی ہے۔ لگتا ہے ریکارڈ پہ سوئی اٹک گئی

سوئی اس لیے اٹکی کہ تم نے یہ نہیں بتایا تم لوگ سُور سے اتنا کیوں بدکتے ہو؟ یاد ہے تم نے ایک وعدہ بھی سُور کے نام پر کیا تھا کہ تمہاری بیوی کی حق تلفی کروں تو سور کھاؤں......

شاید اس لیے کہ نہایت غلیظ اور گھناؤنا لگتا ہے۔

سوتو ہمیں بھی لگتا ہے۔ اوروں کو بھی لگتا ہوگا۔ تمہاری سائیکی میں اس کی اسقدر منفی جگہ کیوں بن گئی ہے۔ احمق ہیں جو اتنا زیادہ بدکیں۔ بس حرام ہے جیسے گدھا حرام، کتا حرام ویسے شاید وجہ یہ ہو کہ گدھا، کتا کوئی کھاتا نہیں سُور لوگ کھاتے ہیں اس لیے ساتھ ساتھ یہ تصور چلا آتا ہوگا۔ تھوتھو، مگر تم ناراض ہو کے سُور کھانا کہہ کے گالی کیوں دیتے ہو...... گدھا کھانا، کتا کھانا کیوں نہیں کہتے۔

اس منطق پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔ اب تم کر لینا...... پھر روشن آراء نے آنکھیں نکالیں...... ارے پنڈت۔ گھر ہی میں فساد کراؤ گے کیا۔ باہر تو بہت کرالئے تم نے۔

پانڈے کھلکھلا کے ہنسے۔

حال ہی میں ایک فساد ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔ کوئی فتنہ پرور مسجد میں گوشت کی پوٹلی پھینک گیا تھا۔ اب وہ گوشت کس کا تھا یہ تحقیقات تو کسی لیبورٹری بھیج کر نہیں کی جا سکی لیکن یہ مان کر چلے لوگ کہ ضرور وہ سُور کا گوشت تھا اس لیے کہ مسجد میں پھینکا گیا تھا۔ مشتعل نوجوانوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کرنے میں پانڈے پیش پیش تھے۔ وہ ان دنوں روشن کے پاس رسول پور آئے ہوئے تھے۔

''تم لڑ کر اکثریت سے پار نہیں پا سکو گے۔ تمہاری معمولی سی غلط حرکتیں تمہاری قوم کے بڑے نقصان کا سبب بن جائیں گی۔ صبر سے کام لو اور اتنی ذرا سی بات سے اتنے اشتعال میں مت آ جاؤ۔'' ''یہ ذرا سی بات ہے؟ کچھ نے آنکھیں نکالی تھیں۔'' ذرا سی بہ ایں معنی کہ پوٹلی اٹھا کے پھینک دو۔ بالٹیاں بھر بھر کے فرش پاک کرلو۔ قصہ ختم۔ جو تمہیں چڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں اپنا سا منھ لے کر رہ جائیں گے۔'' مگر بڑی دیر لگی یہ سمجھانے میں۔ پانڈے نے خود اٹھا کر پوٹلی لے جا کر کوڑے پر پھینکی۔ امام صاحب کے ہاتھ پیر جوڑے۔ ماحول خاصہ گرم ہو چکا تھا لیکن خدا خدا کر کے کوئی بڑا واقعہ ہونے سے ٹالا جا سکا۔

(بڑا واقعہ ہوتا بھی کیسے۔ مسلمانوں میں دَم ہے کہیں؟ کچھ بولیں تو تُم انہیں مار پیٹ کے ٹھیک کر دو۔ قبرستانوں پہ قبضہ بھی کرو اور پھر قبرستان بھیجنے کی دھمکی بھی دو۔ پاکستان تو ہم جانے سے رہے۔ روشن کا کمنٹ تھا۔ بابری مسجد کا معاملہ بھی اُس زمانے میں گرم تھا کوئی روشن کے گھر کی دیوار پر بھی لکھ گیا تھا۔ مسلمانوں کے دو استھان...... پاکستان یا قبرستان)۔

روشن بالکل بُت بن گئی تھی۔ چہرہ ایسا جیسے گردوپیش کا قطعی ہوش نہ ہو۔ (اور واقعی رہ بھی نہیں گیا تھا۔) لانبے لانبے بال جو پانڈے نے اس رات کھول کر اپنے شانوں پر بکھیرے تھے اسی طرح بکھرے ہوئے تھے اور تھوڑا اُلجھ چلے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اُبھر آئے تھے۔ آنکھیں جواب بھی روشن اور چمکدار تھیں ان میں کسی نے حیرت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ حیرت اسی انہونی پر کہ یہ کیا ہوگیا۔ ذہن اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ کہیں یہ بچھو بھی ڈنک مار رہا تھا کہ پانڈے اس کے پاس آکر ہی کیوں اس جہاں سے سدھارے (شاید وہ اپنے اصل مقام پر مرے ہوتے تو روشن کو یہ صدمہ ڈنک مارتا رہتا کہ آخر وقت میں ان کا منھ نہیں دیکھ سکی) پتہ نہیں وہاں لوگ کیا سوچیں گے۔ اور پھر یہ...... دونوں بیٹے یہاں تھے۔ سارے لوگ اکٹھے ہو گئے۔

پانڈے بہت مقبول تھے۔ روشن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لوگوں سے کیا کہے کیسے کہے اس کا شوہر مسلمان نہیں ہے۔ اس کا کریا کرم ہندو عقیدے کے مطابق ہونا چاہئے۔ (وہ پورا گاؤں مسلمانوں کا تھا۔ تھوڑے سے برہمن اور راجپوت گھر تھے...... گاؤں کے کنارے کچھ چماروں کی جھونپڑیاں تھیں۔) مگر پانڈے کو کیا کسی خانے میں رکھا جا سکتا تھا؟ کون سے خانے میں؟ کس خانے میں؟

عرصہ گذرا ایک رات جب وہ روشن کے انہیں لانبے، سیاہ گھنے بالوں میں انگلیاں پھراتے اس کا سر اپنے سینے سے لگائے نیم دراز تھے تو روشن نے کہا تھا پنڈت۔ تم کتنے بڑے ریاکار ہو۔ جمعہ کے روز مسجد میں جا کے نماز بھی پڑھ آئے۔ سچ کہنا کیا پڑھا تھا؟ گائتری منتر؟ یا ہنومان چالیسا؟

پانڈے ہنسے تھے۔ ہمیں ساتوں کلمے یاد ہو گئے ہیں اور الحمد بھی۔ بس وہی ہیر پھیر کے پڑھ لیے اور اٹھک بیٹھک بس ویسے ہی کر لی جیسی دوسرے کر رہے تھے۔ پھر وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئے۔ دو ملاؤں کے بیچ مرغی حرام ہوتے کبھی دیکھی ہے روشن؟

کیوں؟ مرغی کہاں سے سُوجھ گئی پنڈت! وہ بھی حلال اور حرام۔ کھاؤ گے کیا؟

روشن۔ پانڈے اب بھی سنجیدہ تھے۔ ہم سیدھے سادے ہندو تھے۔ تمہارے چکر میں نقلی مسلمان بنے۔ پھر اصلی ہندو بھی نہ رہے۔ ہم پکّے دہریے ہو گئے۔ وہ کیا کہا جاتا تھا۔ نیچری۔

روشن نے ایک جھٹکے سے بال پیچھے پھینکے اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ واہی تباہی مت بکا کرو۔ چلو کھانا لگاتی ہوں۔ وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دیکھا پنڈت پیچھے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ پھر وہ گیس کے چولہے سے کہنی ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔

"روشن۔ پہلے کبھی ہم نے خدا اور مذہب پر اتنا غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ہم سمجھتے تھے ایک پالن ہار ہے۔ سندھیا آرتی کر کے ہم اس کے تئیں اپنا فرض پورا کر لیتے ہیں۔ آس پاس دوسرے مذاہب پر بڑی نکتہ چینی سُنی تھی۔ ہمیں بھی لگتا تھا ہمارا مذہب ہی افضل ہے۔ پھر ہم نے دنیا کو بغور دیکھا۔ تم سے ملنے کے بعد تمہارے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پہلے ہم نرے وکیل تھے روشن، قانون چھوڑ کچھ نہیں جانتے تھے۔ مذہب میں دلچسپی پیدا ہوئی تو ہم نے بہت کچھ پڑھا۔ ہسٹری، سوشیالوجی، اینتھروپالوجی، مذہب۔ اور روشن اب...... اب ہم سارے خانون اور تہہ خانوں سے اوپر اُٹھ چکے ہیں۔"

سنو پنڈت۔ روشن نے چنے کی دال بھرے ٹنڈے کڑھائی سے ایک خوبصورت گہری پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔ ہمارے کسی مذاق کو سنجیدگی سے مت لیا کرو۔ بہ خدا تمہارے مذہب سے ہم نے کوئی واسطہ نہیں رکھا ہمارے لیے تم صرف تم ہو۔ ایک انسان جس نے ہمیں بھرپور محبت دی۔ اور تحفظ۔

جانتے ہیں روشن۔ اور ہم نے صرف تمہاری صورت سے محبت نہیں کی۔ تمہاری ذہانت، تمہاری بذلہ سنجی۔ تمہاری گہری سُوجھ بوجھ تمہاری شرافت سے محبت کی ہے۔ ہم نے یہ سب اپنی بیوی میں چاہا تھا۔ نہیں ملا تبھی تمہاری طرف آئے۔ مگر ہم تمہیں کچھ بتانے کے موڈ میں ہیں۔ ہم نے بڑی شدت سے محسوس کیا ہے کہ کائنات کے اسرار و رموز نے زندگی کے سارے اتار چڑھاؤں نے، موت، بڑھاپے اور دُکھ نے...... انسان میں — ہر دَور، ہر مقام اور ہر رنگ و نسل کے انسان میں ایک ایسی ہستی کا تصور پیدا کیا جو اس سارے گورکھ دھندے پر قادر ہے جسے ہم دنیا کہتے ہیں۔ ایسی ہستی جو باپ کی طرح شفیق ہے اور ہر امتیاز سے بالاتر ہے۔ ایسی ہستی جس سے ہم حق کی حمایت اور جھوٹ کی مخالفت کی اُمید کرتے ہیں، ایسی ہستی جو ہر وقت جاگتی ہے اور ہر ذی رُوح پر نظر رکھتی ہے۔ ایسی ہستی جس سے ہم سب کچھ مانگ سکتے ہیں۔ اس ہستی کو خوش کرنے، اس کے غصے سے بچنے کے لیے پھر ہم نے گناہ و ثواب کے اصول بھی گرڑھے۔ بنیادی طور

پرتو سارے ثواب وہ تھے جن سے کسی کو فائدہ پہنچے اور گناہ وہ جو باعث نقصان ہوں۔لیکن روشن یہ سارا کچھ کرتے ہوئے ہم یہ قطعی بھول گئے کہ مختلف خطوں، مختلف وقتوں اور مختلف خیالات کے تحت لوگوں کے تصورات کا مختلف ہونا نہایت فطری تھا جب کہ بنیادی مقصد ایک ہی تھا...... سارے مذہبی نظام صرف ایک طرف لے جاتے تھے۔اس قادرِ مطلق کی طرف جس نے کائنات تخلیق کی اور جو موت وحیات پر قادر ہے۔ہم نے صرف اسی نظام کو صحیح قرار دیا جس کے پیروکار ہم خود تھے۔دوسرے جو ہمارے دائرے سے باہر تھے قابل گردن زدنی ٹھہرائے گئے۔پھر بنیادی گناہ وثواب میں بھی ہم نے ایسی ایسی شاخیں نکالیں جنکے کوئی معنی نہیں ہیں۔

روشن نے چاولوں کی قاب ٹرے پر رکھی اور تاسف کے ساتھ کہا......ان میں سے ایک گناہ یہ بھی ہے جس کے مرتکب ہم ہوئے ہیں۔ایک غیر مذہب کے پیروکار سے بیاہ۔ہمیں پتہ ہے پنڈت تم نے کلمہ صرف اس لیے پڑھا تاکہ نکاح قانوناً جائز ہو جائے۔

روشن۔لیکن میں بھی ایک خدا میں یقین رکھتا ہوں۔میرا سناتن دھرم بھی یہی کہتا ہے۔ اور میں تمہارے پیغمبر کی بڑی عزت بھی کرتا ہوں۔وہ ایک زبردست انقلابی مصلح تھے۔ایسی شخصیت دوبارہ پیدا نہیں ہوئی جو دنیا کے لوگوں کو اتنی بڑی تعداد میں مسخر کرلے۔جو اپنے سماج میں اتنی زبردست مثبت تبدیلیاں لے آئے۔

مگر پھر بھی تم مسلمان نہیں ہو۔

میں نے کہا نہ روشن۔میں اب ہندو بھی نہیں ہوں۔میں ایک انسان ہوں۔مجھے چڑیوں کی چہچہاہٹ میں، پھولوں کی خوشبو میں، خلا کی وسعتوں میں بکھری کہکشاں میں، دریاؤں کے پانی میں، اُگتے اور ڈوبتے سورج کے حُسن میں خدا کا جلوہ دکھائی پڑتا ہے۔شاید سُورج کی پوجا بھی ہمارے رشیوں مُنیوں نے اسی لیے کرنی شروع کی تھی اور درختوں کی اور دریاؤں کی ...... یہ سب خدا کی قدرت کے مظہر ہیں۔اور روشن میں ہر شخص کے لیے اس کے ذاتی عقائد اور مذہب کا حق تسلیم کرتا ہوں......وہ جس طرح بھی خدا تک پہنچنا چاہے۔لیکن مذہب کے نام پر جتنی دیواریں اٹھیں، جتنے ظلم ہوئے شاید کسی اور ایشو پر نہیں ہوئے ہوں گے۔امریکہ کی دریافت کے بعد اسپینی وہاں پہنچے تو بارُود اور چیچک کے ساتھ وہ وہاں کے مُول باسیوں کے لئے تحفے میں ایک نیا خدا بھی لے گئے تھے۔یقیناً ان کو اِس خدا! کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں دقت ہوئی ہوگی، انہیں

وقت لگا ہوگا اپنے اجداد کی روحوں کو بھلانے میں جنکی وہ پوجا کیا کرتے تھے...... اپنے مقدس بھینسوں کا قتل عام ہوتے دیکھ کر رنج نہ کرنے میں۔ جرمنی کے قبائل شاہ بلوط کے درختوں کو پوجتے تھے......عیسائی مبلغین نے انہیں کٹوا دیا۔

اور روشن معاف کرنا......تمہارے یہاں بھی تبلیغ کی بڑی اہمیت ہے۔ میرا علم یہ نہیں کہتا کہ اسلام محض تلوار کے زور پر پھیلا لیکن اسلام کے پھیلنے میں اسلامی فتوحات کا بہت بڑا دخل رہا ہے مفتوح قومیں فاتح قوموں کا مذہب اختیار کرنے میں عافیت سمجھتی ہیں۔ فاتح قوموں کے تہذیبی اور مذہبی اثرات رفتہ رفتہ ان پر حاوی ہوتے چلے جاتے ہیں۔

''اور تم نے بودھوں کو مار مار کے بھگا دیا۔ ان کی عبادت گاہیں مسمار کیں۔ مہاتما بدھ کو وشنو کا نواں اوتار مان کے انہیں کھا گئے۔ یہ بھی تمہارا ہتکنڈا تھا بدھ مذہب کو ختم کرنے کا۔ روشن نے جلبلا کے کہا۔ پھر ہنس کے بولی لیکن مجھ مسلمان کو گوتم بدھ سے بڑی عقیدت ہے۔ کافی وعظ کہہ چکے۔ گھاس خور۔ چلو کھانا لگا دیا۔''

روشن۔ تمہارے مہاتما بدھ نے مورتی پوجا کی شدید مخالفت کی تھی اور سارے کرم کانڈ کی بھی لیکن ان کے پیروکاروں نے ساری دُنیا میں ان کے بُت نصب کر دیے اور وہ سارا کچھ کرنے لگے جس کی مخالفت انہوں نے کی تھی۔ بات در اصل یہ ہے روشن کہ خدا انسانوں کی ضرورت ہے اور وہ بھی ایسا جو دِکھائی دے۔ تمہارے غیر مرئی خدا کی عبادت بھی بڑی مشکل ہے بھائی۔ اس کے لیے جس گہری سُوجھ بوجھ کی ضرورت ہے وہ عام انسانوں میں کہاں مل پاتی ہے۔ ہاں ڈنڈا ہاتھ میں ہو تو انسانوں کے جسم اور عقائد دونوں پر کرارے وار کرنے کی سُوجھ بوجھ سب میں آ جاتی ہے۔ انسان میں جو احمق شیطان چھپا ہوا ہے اس پر قابو پانا......اب دیکھو نہ بامیان کے عظیم الشان بدھ کو تمہارے طالبان نے......

روشن اب کی سنجیدگی سے ناراض ہوگئی۔ طالبان میرے کیوں؟ اس لیے کہ وہ میرے ہم مذہب ہیں؟ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے پنڈت۔ ان مورتیوں کو افغانستان کے کسی فاتح نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بُت شکن کا لقب پانے والے محمود نے بھی نہیں۔ اتنی ترقی ہو چکی لیکن انسان انسان نہ بنے۔'' اس کے غصے میں دُکھ گھل گیا تھا۔

''ہر مذہب اپنی اصل میں کچھ تھا، پیروکاروں نے اسے کچھ اور بنا دیا۔'' ایک بات بتاؤ

روشن ۔پانڈے نے یکا یک ہنس کے کہا...... ہم مر جائیں گے تو ہماری انتیشٹی کس مذہب کے مطابق ہوگی۔ بھائی ہمیں دفنائے جانے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔قبر میں تمہارے منکر نکیر آ کے پریشان کریں گے وہ الگ۔تم ہماری الٹی سیدھی جھیل لیتی ہو وہ تو گرز اٹھا کے شروع ہو جائیں گے دے دنا دن۔روشن ہونٹ دبا کے دوسری طرف دیکھنے لگی...... پانڈے کی کترنی جیسی زبان چالو تھی......

اور روشن...... ہم کبیر نہیں ہیں کہ مریں تو ہمارے جسم کی جگہ پھول آ جائیں۔آدھے تم بانٹ لو اور آدھے وہ ہماری پہلی محل۔روشن نے پانڈے کو گھور کے دیکھا۔باریک سی مسکراہٹ کی لکیر لبوں سے غائب ہو چکی تھی۔وہ ہنس پڑے...... اچھا روشن ایک بات اور بتاؤ یہ سارے معجزے پچھلوں کے ساتھ ہی کیوں ہوتے ہیں۔پچھلے جنہیں ہم نے دیکھا جانا نہیں۔ ہمارے ساتھ کیوں نہیں ہوتے...... آج۔اب۔ویسے ایک اچھی بات تو ہے۔ہمیں مر کر دوہرا ثواب ملے گا۔ پنڈ دان تو ہوگا ہی۔تم بھی فاتحہ پڑھ لیا کرو گی۔جیسے اپنی ماں کے لیے پڑھتی ہو اور رجب علی چاچا کے لیے......روشن نے تھالی ٹپک دی۔کھانا سامنے رکھ کر یہ ناشدنی......

روشن ہم تم سے بہت بڑے ہیں اس لیے تم سے پہلے ہمارا مرنا تو تقریباً طے ہے۔ تقریباً ہم نے اس لیے لگا دیا کہ شاید تم ہم سے عاجز آ کر خودکشی کی نہ سوچ لو۔مگر ایسا نہیں کرو گی تم۔ تم ہمیں اکیلا چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤ گی۔انہوں نے اس کے لانبے ملائم بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ اچھا سچ کہو کیا کرو گی۔جو اگر پہلے ہم مر گئے تو......؟

''کریں گے کیا۔روشن نے اچانک امنڈ آنیوالے آنسوؤں کو پی لیا...... اب بھی راضی برضا ہیں۔تب بھی ویسے ہی رہیں گے۔'' راضی بہ رضا۔پانڈے نے تینوں الفاظ کو الگ الگ دوہرایا۔'جا ہی بدھی راکھیں رام تا ہی بدھی رہو'

رام وہی ہیں...... وہی ذاتِ اعلیٰ جس کے سر سب کچھ منڈھ کر ہم اپنی ذمہ داریوں سے بری ہو جاتے ہیں۔دُکھوں کو آسانی سے جھیل لیتے ہیں۔یہ دسرتھ پتر رام نہیں ہیں...... یہ ویدوں کے برہمن ہیں۔کبیر کے رام بھی وہی تھے۔اور گاندھی کے رام بھی...... ہم کون سا مذہب اختیار کریں روشن۔لیبل کچھ لگا دو...... ہم تو وہی رہیں گے۔اور بہ حیثیت انسان اپنا فرض بھی نبھائیں گے۔ہم نے اپنی نصف جائداد تمہارے اور تمہارے بیٹوں کے نام کر دی ہے اور نصف دونوں بیٹیوں کے نام۔رہائشی مکان بیوی کو دے دیا ہے۔

"پنڈت ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ بس یہاں رسول پور میں رہنے کا ٹھکانہ تم نے کر دیا ہے۔ دونوں لڑکوں نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ وہ خود بہت کما لیں گے۔ تم نے انہیں اتنی بڑی دولت دی۔ باہر رکھ کر اعلیٰ اسکول کالجوں میں پڑھایا۔ اتنا خرچ کیا۔ اب اور کیا دو گے۔ ہمارا سر پھٹنے لگتا ہے جب ہم سوچتے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر خودغرض اور کمینہ خصلت ہے۔ ایک کمینہ پن ہم نے بھی کیا کہ ایک بے چاری عورت کے شوہر پر قبضہ کیا۔

وہ عورت ایسی بے چاری بھی نہیں ہے روشن۔ اسے ہمارا بھرپور ساتھ ملا ہے۔ سماج نے اسے جو کچھ دیا ہے وہ ہم تمہیں نہ دے سکے اس لیے کہ سماج سے کٹ کے فرد اکیلا ہو جاتا ہے۔ سچ پوچھو تو ہم تمہارے گناہ گار ہیں۔ تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر، مر کر ہم اس گناہ میں اضافہ نہیں کرنا چاہیں گے۔ ہماری دلی خواہش تو یہ ہے مریں تو تمہارے پاس ہوں...... روشن نے پانڈے کے منہ پر اپنی ملائم انگلیاں رکھ دیں......

کے۔ کے ماما ہوتے تو کہتے ارے وہ تو ہمیشہ کا کل جبھا تھا۔ جو بڑی بات منھ سے نکالتا ضرور پوری ہوتی۔ مگر کے۔ کے تو عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ اب وہ داستانیں تھیں نہ بیٹھکیں۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ وہ جو انادی ہے اور اننت۔ اکھنڈ اور ابھید۔ جس کی ابتدا ہے نہ انتہا اور جو موت وحیات سے بالاتر ہے۔ (ہم انسان تو محض موت سے بالاتر ہونے کی خواہش کرتے اور اگلے جہاں گڑھتے رہتے ہیں۔)

—— دروازے پر شور بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ کچھ کے سروں پر صیقل کئے ہوئے پھل چمک رہے تھے۔ لاٹھیوں والے مقامی لوگ تھے۔ الہ باد سے پانڈے کے تینوں داماد، ان کے ایک دور شتہ دار اور ڈِڈا کے جیٹھ کے خاندان والے تھے۔ ڈِڈا کے دونوں بیٹیوں نے خود کو اس جھمیلے سے الگ رکھا تھا۔ روشن کے دونوں بیٹیوں نے ماں کے نام پر دی جانے والی گندی گالیوں کو سننے کے بعد دروازہ کھول دیا تھا اور نہتے باہر نکل گئے تھے۔ اندر آنگن میں روشن ہاتھوں پر قرآن بلند کئے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

تاریخ نے کچھ ہی عرصے میں اپنے آپ کو دوہرایا تھا۔ روشن جب ایک کم عمر لڑکی تھی تو اچانک دنگل لڑ رہے پہلوانوں کے مقابلے نے فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی...... دوکانداروں نے دھڑ ادھڑ دوکانوں کے شٹر گرائے اور سڑکوں پر لوگوں کے بھاگنے سے روشن کی گلی لرز اٹھی۔

تب روشن کی دادی اسی طرح ہاتھ میں قرآن اُٹھائے آنگن میں آ کھڑی ہوئی تھیں اور با آواز بلند تلاوت کرنے لگی تھیں۔ یا مولا مشکل کشا...... ملازمہ نے سر ڈھانپ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کئے تھے۔

(حضرت عثمان جس وقت شہید ہوئے وہ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ ان کے خون کے چھینٹے اللہ کے کلام کو رنگین بنا گئے) جو ہونا ہے وہ ہوتا ہے۔ ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ روشن کے دادا جو فصل اُٹھانے گاؤں گئے ہوئے تھے اور اسی دن وہاں سے واپس چلے تھے، راستے میں مارے گئے۔ شہر کے اندر کچھ نہیں ہُوا۔

روشن بے چین ہو کر باہر نکل آئی اور بیٹوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئی۔

یہ تمہارے رشتے دار ہیں۔ جانکی رمن پانڈے کی اپنی اولادیں...... اس نے زور سے چلا کر کہا۔

پہلے تو اس کلٹا کو ہی مارنا چاہتے۔ بھیڑ سے کوئی جواباً چلایا۔

''تم لوگ کاغذات لے آؤ۔ امن سکون کے ساتھ ہمارے ساتھ بیٹھو۔ ہم تینوں اس جائداد سے دستبردار ہوتے ہیں جو پنڈت ہمارے نام کر گئے ہیں۔'' روشن کو اچھی طرح یاد تھا۔ دِدّا کے جیٹھ کے یہاں گوشت کھانے نہ کھانے کو لے کر جو تکرار شروع ہوئی تھی وہ جائداد کے بٹوارے تک پہنچ کر ختم ہوئی تھی۔ لڑکوں کو پیچھے دھکیل کر اس نے یہ جملے بھی چلا کر ادا کئے۔

تبھی کسی انہونی کے خوف سے جیپ لے کر بھاگے چلے آ رہے بزرگ اونکار ناتھ مشر موقعہ پر پہنچ گئے۔ ستر سے اوپر ہو چکے تھے اور بیوی کے مرنے کے بعد تقریباً سنیاسی والی کیفیت ہو گئی تھی۔ دنیا کے سرد وگرم دیکھنے کے بعد لوگوں کے مزاج اور خصلتوں سے پوری واقفیت تو تھی ہی، دنیا کی بے ثباتی بھی دل پر نقش ہو گئی تھی۔ پانڈے کے تینوں داماد لاؤلشکر لے کر رسول پور کے لیے نکل گئے ہیں۔ پانڈے وہاں مرے تھے اس لیے لوگوں نے باقاعدہ نماز جنازہ پڑھا کر انہیں قبرستان میں دفن کر دیا تھا یہ پکّی اطلاع آ چکی تھی مرنے سے پہلے ہی انھوں نے نصف جائداد لڑکوں اور روشن کے نام کر دی تھی یہ سُن گن بھی تھی۔ ادھر الیکشن قریب آ رہے تھے رسول پور میں آئی۔ ایس۔ آئی کے ایجنٹوں کے سرگرم ہونے کی افواہ بھی کبھی کبھار کان میں پڑ رہی تھی۔ سب کچھ ملا جُلا کر صورتِ حال نہایت خطرناک تھی۔ وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُٹھے۔

پانڈے کی پہلی بیوی ماتھے تک گھونگھٹ کھینچ کے پاس آ گئیں۔" بھائی صاحب لڑکوں اور ان کی ماں پر آنچ مت آنے دیجئے گا۔روشن آرا نے "انہیں" کبھی ہم سے چھینا نہیں۔اور لڑکے تو انہیں کا خون ہیں نہ۔دھرم دوسرا ہونے سے خون نہیں بدل جائے گا۔" ان کی آواز بھر آ گئی۔داماد وں کو ہم کچھ نہ کہہ سکے۔

اونکار ناتھ کو بھی خشک ویران آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔بیوی کے مرنے کے بعد پہلی بار رونے کو جی چاہا۔قدرے توقف کے بعد بولے۔بھگوان سے مناؤ ہمارے جانے سے پہلے کوئی انرتھ نہ ہو چکا ہو۔اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ان کی آنجہانی بیوی بھائی پر جان چھڑکتی تھیں۔اور اس مناسبت سے انہوں نے روشن اور لڑکوں کو شرفِ قبولیت بخشا تھا لیکن خود ان کے بیٹے اس وقت جانکی رمن کے دامادوں کا ساتھ دے رہے تھے۔بیشک وہ ان کے ساتھ نہیں گئے تھے لیکن کچھ بولے بھی نہیں۔اور اونکار ناتھ کے بھتیجے۔وہ تو ساتھ چل بھی دیے۔اس وقت انہیں ساری رشتہ داریاں یاد آ گئی تھیں۔

جانکی رمن کی سونیکے دل والی کالی بیوی کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔اونکار ناتھ عین وقت پر پہنچ گئے تھے۔ورنہ واقعی جانے کیا ہو جاتا۔معاملہ سلجھ گیا۔زمین جائداد سے روشن دست بردار ہو جائے گی، یہ وعدہ، کچھ شرطیں اور —— قبر سے اکھاڑ کر نکالی گئی پانڈے کی لاش لے کر لوگ واپس آ گئے۔

چھوٹی بہو—— اونکار ناتھ کا روشن سے یہ پہلا سابقہ تھا۔اجازت دے دو۔انہوں نے نرمی سے کہا تھا ورنہ تم تو صرف تین ہو۔گاؤں میں نہ جانے کتنے ایسے معصوم مارے جائیں گے جن کا تمہارے اس گورکھ دھندے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔فضا خراب ہے۔خود کہہ دو کہ اچھا ٹھیک ہے۔لے جایئے۔اسی میں خوبصورتی ہے۔سد بھاؤ بنا رہے گا۔جن کی مت پلٹ گئی ہو ہم ان سب سے نہیں لڑ سکتے بیٹا۔

پنڈت کے جسدِ خاکی کی ایسی بے حرمتی۔روشن پچھاڑیں کھانے لگیں۔کتنا کہا تھا اس نے گاؤں کیلوگوں سے، بیٹوں سے کہ اسے ان کے گھر الہ باد پہنچا دیا جائے لیکن لوگ نہیں مانے۔

"چھوٹی بہو—— مرا ہوا انسان سڑنے کے لیے نہیں چھوڑا جاتا۔نہ گھر میں نہ سڑک پر۔

یہ سب جانتے ہیں۔''لوگوں کے لاش لے جانے کے بعد اونکار ناتھ کچھ دیر وہیں بیٹھ گئے تھے۔
''اب اسے جلاؤ یا دفن کرو۔ وہ تو دُنیا سے گیا۔ پنچ تتو پنچ تتو میں مل جاتے ہیں۔ مٹی، مٹی میں؛ آکاش، آکاش میں؛ آگ، آگ میں؛ پانی، پانی میں اور ہوا ہوا میں۔ جل کے بھی یہی ہوتا ہے اور دفن ہو کے بھی یہی ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ دفن ہونے پر یہ عمل بہت سست رفتار کے ساتھ ہوتا ہے۔ مگر لوگ اس بات کو نہیں سمجھیں گے۔ مرنے کے بعد ساری رسمیں صرف زندوں کی تسلّی کے لیے ہیں۔ ہم تو معمولی آدمی ہیں۔ ہم کیا کہیں مگر رشیوں مینوں نے شریر کو چولا قرار دیا ہے جسے آتما بدلتی رہتی ہے۔ آتما جو اجر اور اَمر ہے۔ یہ مانیں تو دفن کئے جا چکے آدمی کو اکھاڑنے کی کہیں سے منطق نہیں بنتی بٹیا۔ مگر ہم کیا کریں۔ بھگوان کو بھی مُورکھوں سے خاص پیار ہے اسی لیے اس نے مُورکھ اتنی بڑی تعداد میں پیدا کئے۔ صبر کرو۔

اونکار بھائی صاحب۔ روشن نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دھرتی آپ جیسے دیوتا سمان لوگوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ اتنی سی مہربانی کیجئے۔ ہمیں الہ باد لے چلئے۔ کسی جگہ رکھ دیجئے گا۔ ہمارے کچھ رشتے دار بھی ہیں وہاں۔ گرچہ سب نے ناتہ توڑ لیا تھا۔ رجب علی نانا تو چلے ہی گئے تھے اب نانی بھی نہیں رہیں۔ وہ پھر زار و قطار رونے لگی۔

——— سکون کے ساتھ بہتی گنگا کے کنارے دُھو دُھو کر جلتی چتا۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں لپکتے زرد شعلے۔ آسمان پر اکا دکا بادل تیر رہے تھے۔ سبزے میں چھپے جھینگروں نے شور مچا رکھا تھا۔ آدمی جُن جا چکے تھے۔ لکڑیوں کی تڑ تڑاہٹ، مینڈکوں اور جھینگروں اور دریا کی لہروں کی آواز کے باوجود سناٹا...... ابدی اور ازلی اور لامتناہی۔ آگ کی اور بھی کئی ڈھیریاں تھیں جو انسانوں کو کھا رہی تھیں...... پانچوں عناصر پانچوں عناصر میں تحلیل ہو رہے تھے۔

ندی رے ندی، کتنے لوگوں کو پھنکتے دیکھا؟ اس کنارے اور اس کنارے؟ یہاں سے وہاں تلک...... جہاں سے تیری ابتدا ہے اور جہاں تک تیری انتہا؟

پیڑوں کے جھرمٹ کے پیچھے سے نکل کر وہ سامنے آ گئی۔ ایک طرف کو زمین ذرا سی اونچی تھی۔ پیچھے ایک قطار سے درخت کھڑے تھے۔ سر سبز، شاداب، لازوال۔ وہ اس اونچی زمین پر کھڑی ہو گئی۔ ہلکے پھلکے بدن کی دراز قدر، گوری (فی الوقت کاغذ جیسی سفید) عورت۔ ہوا کے

جھونکے سے اس کی باریک سفید ساری کا کناری دار آنچل پھڑ پھڑایا۔ اچانک ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس پورے منظر پر محیط ہو اٹھی ہو۔

یہ آدمی جو شعلوں کی نظر ہوا۔ جس کے گھنے بالوں کو آگ کی لپٹوں نے ایک لمحے، محض ایک لمحے میں چاٹ لیا اور جس کے (بڑھاپے کے باوجود) مضبوط سر کو کپال کِریا کے دوران لاٹھی مار کر پھوڑا گیا۔ اس کا کون تھا۔؟ کیوں آئی تھی وہ یہاں شمشان گھاٹ پر جہاں عورتوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے؟ وہ خود کون تھی؟ یہ سارے انسان کون تھے جو قبر کے کیڑوں اور چتا کے بدن چاٹنے والے شعلوں کو بُھلا کر جان لینے اور جان دینے پر تل جاتے ہیں؟ کیوں انہوں نے اپنے اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے بیچ نفرت کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں؟

''کسی بھلاوے میں مت رہنا روشن آرا بیگم۔ یہ دوسری دُنیا کا تصور ہمیشہ زندہ رہنے اور موت کو شکست دینے کی انسانی خواہش کے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ آتما کا اجر اَمر ہونا یہ روح کا نا قابل تسخیر ہونا سب فراڈ ہے۔ ہمارا تمہارا ساتھ بس اتنا ہی ہے جتنا ہم جئیں گے۔ باقی تمہارا جی چاہے تو ہمارے نام سے بھی فاتحہ پڑھ لیا کرنا...... پھر وہ شیطنت کے ساتھ مسکرائے ...... مگر کیا تمہاری فاتحہ ہم تک پہنچے گی۔ ہم ٹھہرے......''

بجھتی چتا کے دھویں کی طرح بے کلی نے روشن کے اندر چکّر کاٹے۔

ساری جنتیں، سارے جہنم ہم اسی دنیا میں جھیل لیتے ہیں اور یہ ہمارے ہی تخلیق کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمارے اعمال کے نتیجے—''

روشن آرا نے چھنگلیا سے آنسو خشک کیے۔ الوداع جانکی رمن پانڈے۔

☆☆☆

نام : ذکیہ سلطانہ مشہدی

قلمی نام : ذکیہ مشہدی

تعلیم : ایم۔ اے (نفسیات) لکھنؤ یونیورسٹی

تصنیفات :

پرائے چہرے (افسانوی مجموعہ)

تاریک راہوں کے مسافر (افسانوی مجموعہ)

صدائے بازگشت (افسانوی مجموعہ)

تراجم :

نیلا چاند ہندی ناول، تصنیف: شِو پرشاد سنگھ — ہندی سے اُردو

پکھیرو اُردو افسانے تصنیف: رام لعل — اُردو سے ہندی

پرایا گھر اُردو افسانے تصنیف: جیلانی بانو — اُردو سے انگریزی

صنعتی نفسیات

انبارمل نفسیات

عمومی نفسیات

انگریزی سے اُردو۔ پوسٹ گریجویٹ سطح کی کتابیں برائے فروغ اردو کاؤنسل

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-110006 (DELHI)

PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540 E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

81-87667-62-1